Registered No. L. 4186

جلد ۱۸ — عدد ۳

ربیع الاول ۱۳۶۰ھ

۱۹۴۱ء

مئی ۴۱ء

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علومِ قرآنی و حقائقِ فرقانی کا ذخیرہ

مرتبۂ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

مبارک پارک۔ پونچھ روڈ۔ لاہور

قیمت فی پرچہ ۸ر

قیمت سالانہ صر

تفہیمات

بعض معرکۃ الآرا مسائلِ اسلامی کی تشریح و توضیح

یہ کتاب مؤلف کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن میں اسلام کے ان مہمات مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے جن کے متعلق آج کل عموماً لوگوں میں غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ مثلاً توحید، ہدایت و ضلالت، عبادت، جہاد، آزادی، رواداری، قومیت اسلامی، عقیدۂ توحید کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ضروری ہونا، رسول کی صحیح حیثیت، رسالت محمدی کا ثبوت عقلی، شریعت اسلامی میں حدیث کی اہمیت قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق، منکرین حدیث کے شبہات کا ازالہ وغیرہ۔

حصہ دوم زیر طبع ہے اور وہ بھی ایسے ہی اہم مسائل پر مشتمل ہے۔

قیمت حصہ اول بیجلد ایکروپیہ آٹھ آنے قیمت مجلد دو روپیہ علاوہ محصولڈاک

تنقیحات

تنقیحات یہ مولف کے اُن مضامین کا مجموعہ ہے جنمیں اسلام اور مغربی تہذیب کے تصادم اور اس سے پیدا شدہ مسائل پر تنقیدی اور تعمیری دونوں حیثیتوں سے بحث کی گئی ہے۔ مسلمانوں کی زندگی پر جن جن پہلوؤں سے مغربی تہذیب و تمدن اور مغربی تعلیم نے اثر ڈالا ہے۔ قریب قریب اِن سب پر ان مضامین میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اِن اُلجھنوں کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو مغرب سے مرعوب اور اسلام سے ناواقف ہونے کی بدولت عموماً مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہو گئی ہیں۔

ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت غیر مجلد -/۴/۱ مجلد -/۸/۱ محصولڈاک -/۴/-

فہرست مضامین

ماہ ربیع الاول سنہ ۱۳۶۰ھ (مطابق مئی سنہ ۱۹۴۱ء) جلد ۱۸۔ عدد ۳

باہتمام ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر دین محمدی الیکٹرک پریس سرکلر روڈ میں طبع ہو کر

دفتر ترجمان القرآن پونچھ روڈ۔ مبارک پارک لاہور سے شائع ہوا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

محرم کی اشاعت میں جماعت اسلامی کی تشکیل کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا اس کو دیکھ کر بہت سے اللہ کے بندوں نے ایسی ایک جماعت میں شامل ہونے کا ارادہ ظاہر کر دیا تھا، بلکہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے مقامی جماعتیں بننے کی اطلاعیں بھی آنی شروع ہو گئی تھیں۔ پھر صفر کی اشاعت میں درخواست کی گئی کہ جو لوگ اس نقشہ پر کام کرنا پسند کرتے ہیں وہ براہ کرم ہم کو اطلاع دیں تاکہ ان کے درمیان ربط پیدا کرنے کی کوئی صورت نکالی جا سکے۔ اس کے جواب میں بہت سے وہ لوگ بھی گویا ہوئے جو دل میں ارادہ رکھتے تھے مگر اب تک خاموش تھے۔ اس طرح وسط ماہ اگست تک تقریباً ڈیڑھ سو اصحاب کی فہرست تیار ہو گئی پھر یہ مناسب سمجھا گیا کہ ۲۵ اگست کو لاہور میں ان اصحاب کا ایک اجتماع عام منعقد کر لیا جائے۔ چنانچہ اجتماع کی دعوت دے دی گئی۔ تاریخ مقررہ پر ۷۵ اصحاب تشریف لائے، جن میں سے بعض اپنی مقامی جماعتوں کے نمائندہ مختار تھے، اور بعض انفرادی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ چار روز تک مشاورت جاری رہی۔ جماعتی تشکیل کا جو ابتدائی خاکہ محرم کے پرچہ میں شائع کیا گیا تھا اس پر غور کیا گیا اور باہمی مشورہ سے بالاتفاق ایک دستور جماعت مرتب ہوا جو اس اشاعت میں درج کیا جا رہا ہے۔ پھر تمام اصحاب نے دستور کے مطابق پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ کلمۂ شہادت ادا کیا اور جماعتی نظم کے ساتھ اسلامی نصب العین کے لئے جدوجہد کرنے کا عہد کیا۔ پھر آئندہ کام کے متعلق ایک پروگرام بھی طے ہو گیا جس پر توکلاً علی اللہ کام شروع کر دیا گیا ہے۔ یہ سب مراحل خدا کے فضل سے بخوبی طے ہو گئے۔ اب آئندہ مراحل کی کامیابی رفقاء کے خلوص نیت اور اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔

دستورِ جماعت کے بارے میں چند کلمات بطور تشریح عرض کرنے ضروری ہیں۔ اگرچہ دستور کو پڑھ کر ہر شخص خود ہی اس جماعت کی نوعیت اور اس کی ترکیب اور اس کے مقصد کے متعلق بآسانی رائے قائم کر سکتا ہے، تاہم بعض امور ایسے ہیں جن کی توضیح دستور میں نہ کی جا سکتی تھی، لہٰذا یہاں ان کو بیان کر دیا جاتا ہے۔

اس دستور کی بنیاد جس خیال پر رکھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اسلام کے کسی ایک جزء کو، یا مسلمانوں کے دنیوی مقاصد میں سے کسی مقصد کو لے کر نہ اٹھیں بلکہ اصل اسلام اور پورے اسلام کو لے کر اٹھیں، جس مقصد کے لئے انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے وہی ہمارا مقصد ہو۔ جس چیز کی طرف انہوں نے دعوت دی اُسی کی طرف ہم دعوت دیں۔ جس طرز پر وہ ایمان لانے والوں کی جماعت بناتے تھے اسی طرز پر ہم جماعت بنائیں، جو نظامِ جماعت اُن کا تھا وہی ہمارا ہو، جن ضوابط کو وہ اپنی جماعت میں نافذ کرتے تھے انہی کو ہم بلا کسی کمی و بیشی کے نافذ کریں، اور جس طریقہ سے وہ اپنے نصب العین کے لئے سعی و جہد کرتے تھے اسی طریقہ سے ہم جد و جہد کریں۔ غرض یہ کہ ہماری یہ تحریک ذرہ برابر نہ اسلام سے کم کسی چیز پر مشتمل ہو اور نہ اُس سے زائد، بلکہ پورے کے پورے اسلام ہی کو ہم اپنی تحریک بنالیں۔ اسی لئے ہم اُس جماعت کو جو اس دستور پر بنی ہے "جماعتِ اسلامی" کہتے ہیں کیونکہ اُس کا عقیدہ، نصب العین، نظامِ جماعت، اور طریقِ کار بعینہٖ وہی ہے جو اسلامی جماعت کا رہا ہے۔

قریبی دور میں مسلمانوں میں جو تحریکیں اٹھی ہیں ان میں چار اصولی خرابیاں تھیں۔ ایک یہ کہ اُن میں نفسِ اسلام کو بنائے حرکت نہیں ٹھیرایا گیا تھا بلکہ ان کے اندر بنائے حرکت یا تو اسلام کا کوئی ایک جزء رہا تھا جس سے محرکین کو خاص دلچسپی تھی، یا مسلمانوں کا کوئی دنیوی مقصد تھا جسے براہِ راست اسلام سے کوئی تعلق نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ ان کا نظامِ جماعت بے کم و کاست اسلامی طرز کا نہ تھا بلکہ مختلف غیر مسلم جماعتوں کے نظامِ ترکیبی کی نقل کی گئی تھی۔ تیسرے یہ کہ ان میں تمام عرفی مسلمانوں کو حقیقی معنی میں مسلمان سمجھ کر ہر قسم کے رطب و یابس آدمی بھر لئے گئے جن کی سیرتوں پر ہرگز وہ اعتماد نہ کیا جا سکتا تھا جس کا ایک حقیقی مسلمان مستحق

ہوتا ہے، اور یہی چیز آخر کار ان تحریکوں کی ناکامی کا سبب بنی، کیونکہ عام ارکان سے لے کر کارکنوں اور لیڈروں تک کم ہی آدمی ایسے تھے جو اعتماد کے لائق ہوں۔ چوتھے یہ کہ ان کی دعوت عام نہ تھی، صرف پیدائشی مسلمانوں تک محدود تھی، اور غیر مسلموں کے لیے صرف یہی نہیں کہ اُن میں کوئی کشش نہ تھی بلکہ بالفعل اُن میں سے اکثر میں غیر مسلموں کو اسلام سے اور زیادہ دور بھگا دینے کا سامان موجود تھا۔

ہم نے ان چاروں خرابیوں سے بچنے کی انتہائی کوشش کی ہے۔ یہاں عین اسلام ہی کو بنائے حرکت بنایا گیا ہے۔ نظام جماعت بے کم و کاست وہی کا وہی لیا گیا ہے جو نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ جماعت کا تھا۔ جماعتی ضوابط ایسے رکھے گئے ہیں کہ مسلمانوں کی قوم میں سے صرف وہ صالح عنصر چھٹ کر جماعت میں آئے جو حقیقت میں ایمان و عمل صالح کی دولت رکھتا ہو۔ اور جماعت کی دعوت محض پیدائشی مسلمانوں تک محدود نہیں رکھی گئی ہے بلکہ تمام روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کے لیے عام ہے، آدم کا جو بیٹا اور جو بیٹی توحید الٰہ کا اعتقاد، محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا اتباع، حکومت الٰہیہ کا نصب العین اور ضابطۂ شریعت کی پابندی قبول کرلے اس کے لیے جماعت اسلامی کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

"جماعتِ اسلامی" کے نام سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اس جماعت سے باہر جو لوگ ہیں ان کو ہم غیر مسلم سمجھتے ہیں۔ ہم نے یہ نام جس وجہ سے اختیار کیا ہے وہ اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ جس جماعت کے مسلک میں نہ اسلام سے کم کوئی چیز ہو نہ اُس سے زائد، جس کا عقیدہ وہی ہو جو اسلام کا ہے، نصب العین وہی ہو جو اسلام نے پیش کیا ہے، نظام جماعت وہی ہو جس کا نقشہ کتاب و سنت میں ملتا ہے، اور کام کا ڈھنگ وہی ہو جو انبیاء نے سکھایا ہے، اس کے لیے آخر جماعت اسلامی کے سوا اور کیا نام ہو سکتا ہے۔ مگر ہم ہرگز یہ فرض نہیں کرتے اور ایسا فرض کرنے کا ہم کو حق نہیں ہے کہ ایمان بس اسی جماعت کے اندر منحصر ہے اور اس کے باہر جو لوگ ہیں وہ مومن نہیں ہیں۔ بلکہ اگر کوئی اس جماعت کی مخالفت کرے تب بھی مجرد اس کی مخالفت کی بنا پر ہم اس کو غیر مومن نہیں کہہ سکتے۔ اس میں شک نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں ایمان اُس جماعت کے اندر ہی منحصر ہوتا تھا جو انبیاء کی قیادت میں بنتی تھی، اور یہ بھی صحیح ہے کہ انبیاء کے بعد اُن کے خلفاء کے عہد میں جب تک اصل جماعت کا نظام

برقرار رہا، اُس سے علیحدہ رہنے کے معنی اسلام سے علیحدگی ہی کے تھے جیسا کہ صریح طور پر نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔ لیکن بہت بڑا فرق ہے اُس جماعت میں جو ابتداءً نبی کے زیر قیادت بنی ہو اور اُس جماعت میں جو ابتدائی نظامِ جماعت کے درہم برہم ہوجانے کے بعد دوبارہ اس کی تجدید کے لئے کوشش کرے۔ پہلی جماعت دنیا میں صرف ایک ہی ہوگی اور اس کے باہر کفر ہوگا، مگر دوسری قسم کی جماعتیں دنیا میں بہت سی ہوسکتی ہیں اور اُن میں سے کسی جماعت میں شامل نہ ہونے کے اسباب کفر و نفاق کے سوا اور بھی ہونے ممکن ہیں۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص ہم سے زیادہ صاحبِ ایمان ہو اور وہ نیک نیتی کے ساتھ کسی غلط فہمی کی بنا پر ہماری مخالفت کرے۔ اپنی حد تک ہم انتہائی کوشش کریں گے کہ اپنے مسلک اور طریق کار کو عین اسلام کے مطابق رکھیں تاکہ کسی شخص صالح و مومن کے لئے ہم سے علیحدہ رہنے کی کوئی وجہ نہ ہو اور اس طرح تمام اہل ایمان آخر کار ایک ہی نظام میں منسلک ہوسکیں۔ لیکن اپنی اس آرزو کو ایک حاصل شدہ واقعہ فرض کر کے ہم ہرگز فتنہ میں نہ پڑیں گے۔ ہم کو بہر حال مسلمانوں میں ایک فرقہ بننے سے بچنا ہے اور اُس غلو سے ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں جو ہمیں خیر کے بجائے شر کا خادم بنا دے۔

ہمارے نصب العین میں محض لفظ "حکومت" کو دیکھ کر بعض لوگ یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ہم نے سیاسی اقتدار کو اپنا مقصود بنایا ہے اور اسلام کو بالکل ایک سیاسی چیز بنا کر رکھ دیا ہے۔ حالانکہ دراصل زمین و آسمان کا فرق ہے مجرد حکومت میں اور اُس حکومت الٰہیہ میں جس کو ہم اپنا نصب العین کہتے ہیں۔ "حکومت الٰہیہ کے قیام" سے ہماری مراد بعینہٖ وہی ہے جو لیظھرہٗ علی الدین کلہ سے قرآن کی مراد ہے، اور یہ ہمارا خود ساختہ نصب العین نہیں ہے بلکہ اللہ نے اسی کو اپنے نبی کی بعثت کا مقصد قرار دیا ہے۔ اگر اس چیز کو اپنی سعی و جہد کا مقصود بنانے پر کوئی ہمیں الزام دینا چاہتا ہے تو وہ خود ہی سوچ لے کہ وہ کس کو الزام دے رہا ہے۔

قرآن کے مطالعہ سے ہم نے جو کچھ سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ کائنات کا پورا نظام "اسلام" یعنی اللہ تعالیٰ

کی اطاعت پر قائم ہے۔ اس نظام کے اندر انسان جس کو طاعت و عصیان کا اختیار دیا گیا ہے، اگر اپنے دائرۂ اختیار کی حد تک اللہ کی اطاعت سے آزاد ہو جائے اور اپنے نفس کا حکم یا کسی اور کا حکم ماننے لگے تو یہ نہ صرف حق کے خلاف ہے، نہ صرف فطرت کائنات اور فطرت انسانی کے خلاف ہے، بلکہ اس کا لازمی نتیجہ فتنہ و فساد ہے، کیونکہ اللہ کے سوا کائنات کے کسی جزء میں کسی حیثیت سے بھی کسی دوسرے کا حکم چلنا نظام کائنات کی اُس ہم آہنگی کی ضد واقع ہو جاتا ہے جو اقتدار اعلیٰ کی وحدت پر قائم کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس فتنہ کو مٹانا چاہتا ہے اور اس کا منشا یہ ہے کہ انسان جس طرح غیر شعوری طور پر مُسلم ہے اُسی طرح شعوری طور پر بھی اللہ کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرکے اور اس کے امر تشریعی کی ماتحتی قبول کرکے مسلم ہو جائے۔ اسی چیز کا نام "الاسلام" اور "الدین" ہے جیسا کہ فرمایا اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ۔ لیکن اللہ اس کام کو اپنی قدرت قاہرہ کے زور سے جبراً نہیں کرتا، بلکہ انبیاء کے ذریعہ سے انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ تم الدین اور الاسلام کو اختیار کرو۔ پھر انسانوں میں سے جو لوگ اسے اختیار کرلیں اُن کو وہ اپنی پارٹی بناتا ہے اور اس بات پر مامور کرتا ہے کہ پہلے تو تم فتنے کو مٹاؤ، یعنی میری زمین میں میرے سوا جس کا حکم چل رہا ہے اس کی حکمرانی کا خاتمہ کردو، پھر اس بات کی کوشش کرو کہ سب انسان الدین اور الاسلام کو اختیار کرلیں۔ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ، اور هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ۔ پس دراصل غیر الٰہی اقتدار کے فتنے کو مٹانا اور انسانی زندگی کے اختیاری حصہ میں اللہ کی حکومت قائم کرنا تو عین مقصد بعثت انبیاء ہے اور اللہ کے حکم سے انبیاء کرام نے جہاں بھی جماعت اسلامی بنائی ہے، اس کا مقصد وحید یہی رہا ہے۔ اس مقصد کو سن کر اگر لوگ چونکتے ہیں تو بجز اس کے کہ ہم قرآن کے علم سے ایسے لوگوں کی محرومی پر ماتم کریں اور کیا کرسکتے ہیں۔

رہا بعض لوگوں کا یہ خیال کہ اس نصب العین میں روحانیت کے بجائے مادیت ہے، تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ جو لوگ ایسا خیال رکھتے ہیں وہ دراصل روحانیت کے اسلامی تصور کے بجائے کسی جاہلی تصور میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اسلام میں روحانیت کا کوئی تصور قرب خداوندی کے سوا نہیں ہے۔ اور خدا سے قرب کی اس سے بڑھ کر کوئی صورت متصور نہیں ہو سکتی کہ ایک مشن میں انسان اور خدا دونوں ایک دوسرے کے رفیق کار اور ساتھی ہوں۔ نمازیں، روزے میں اور تمام عبادات و معاملات میں تو بندہ عبد ہے اور خدا معبود۔ مگر قیام حکومت الٰہیہ کی جدوجہد میں عبد کو یہ شرف نصیب ہوتا ہے کہ وہ معبود کا رفیق بن جاتا ہے، معبود اس کا مددگار ہوتا ہے، اور وہ معبود کا مددگار۔ کیا بندے کے لیے اس سے بڑھ کر بھی روحانی ترقی و عروج کے کسی مرتبے کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا افضل الناس مومن مجاهد بنفسه و ماله فی سبیل اللہ۔ پس ہمارے نزدیک تو یہ بات علم دین کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ جو چیز کمال روحانیت بلکہ بلندترین مرتبۂ روحانیت کی طرف لے جانے والی ہے اُس میں کسی کو مادیت کے سوا کچھ نظر نہ آئے۔

طبقات کی جو تقسیم دستور میں کی گئی ہے وہ بظاہر ایک اجنبی چیز معلوم ہو گی اور شاید اعتراض کیا جائے کہ یہ چیز تم نے خود ایجاد کی ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ دور نبوت میں اس چیز کا نشان ملتا ہے، اور خود قرآن میں اس کی طرف صریح اشارات موجود ہیں۔ مثلاً ایک وہ گروہ ہے جس کے متعلق فرمایا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (اہل ایمان میں سے کچھ وہ ہیں جنہوں نے اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو سچا کر دکھایا)۔ یہ لوگ ہر قربانی کے لئے مستعد تھے، ہر پکار پر لبیک کہتے تھے، اور جس حق پر ایمان لائے تھے اس کی خاطر کوئی چوٹ کھانے اور کوئی مشقت برداشت کرنے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جس کے متعلق فرمایا لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ

وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ...... وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ۔ یہ وہ لوگ تھے جو دل سے تو سچے خیر خواہ تھے اور دل میں تمنا بھی رکھتے تھے کہ راہ خدا میں جانفشانی دکھائیں، مگر اپنے حالات سے واقعی مجبور تھے۔ تیسرا گروہ وہ ہے جس کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے: لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ یہ وہ لوگ تھے جو ایمان رکھتے تھے، ایمان کے کم سے کم مقتضیات کو پورا بھی کرتے تھے مگر محض ضعف ایمانی کی وجہ سے راہ خدا میں کوئی بڑی چوٹ سہنے اور کسی بڑے نقصان کو برداشت کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔

یہاں تمام آیات کا استقصا مقصود نہیں ہے، صرف یہ بتانا ہے کہ طبقات کی یہ تقسیم کتاب و سنت ہی کے اشارات سے ماخوذ ہے اور اس کو موجودہ حالات پر کافی غور و خوض کے ساتھ منطبق کیا گیا ہے۔ ان مختلف طبقوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرنے میں مصلحت یہ ہے کہ اس طرح ہر طبقہ اپنے حدود کو پہچان کر اپنے دائرۂ عمل میں کام کرے گا، اور ایک طبقہ کی کمزوریاں دوسرے طبقہ کے لئے سنگِ راہ نہ بن سکیں گی۔ ان کو خلط ملط کر دینے میں یہ اندیشہ ہے کہ ضعفا اپنی مصلحتوں کی خاطر نہ خود کوئی بڑا کام کر سکیں گے اور نہ دوسروں کو کرنے دیں گے۔

دستور جماعت اسلامی

عقیدہ

۱۔ جماعت اسلامی کا بنیادی عقیدہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ہے یعنی صرف اللہ ہی ایک الٰہ ہے، اسکے سوا کوئی الٰہ نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

تشریح:۔ اس عقیدہ کے پہلے جز یعنی اللہ کے الٰہ واحد ہونے اور کسی دوسرے کے الٰہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور آسمان، اور جو کچھ آسمان و زمین میں ہے، سب کا خالق، پروردگار، مالک، مدبّر اور حاکم صرف اللہ ہے، اِن میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے

اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان اللہ[1] کے سوا کسی کو ولی و کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا، فریاد رس اور حامی و ناصر نہ سمجھے، کیونکہ کسی دوسرے کے پاس کوئی اقتدار ہی نہیں ہے۔ اللہ[2] کے سوا کسی کو نفع یا نقصان پہنچانے والا نہ سمجھے، کسی سے تقویٰ اور خوف نہ کرے، کسی پر توکل نہ کرے، کسی سے امیدیں وابستہ نہ کرے، کیونکہ تمام اختیارات کا مالک وہی اکیلا ہے۔ اللہ[3] کے سوا کسی سے دعا نہ مانگے، کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے، کسی کو مدد کے لیے نہ پکارے، کسی کو خدائی انتظامات میں ایسا دخیل اور زور آور بھی نہ سمجھے کہ اسکی سفارش سے قضائے الٰہی ٹل سکتی ہو، کیونکہ خدا کی سلطنت میں سب بے اختیار رعیت ہیں خواہ وہ فرشتے ہوں یا انبیا یا اولیاء۔ اللہ[4] کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے، کسی کی پرستش نہ کرے، کسی کو نذر نہ دے، کسی کی نیاز مندی نہ اختیار کرے، کیونکہ تنہا وہی عبادات کا مستحق ہے۔ اللہ[5] کے سوا کسی کو بادشاہ، مالک الملک، مقتدر اعلیٰ نہ تسلیم کرے، کسی کو باختیارِ خود حکم دینے

اور منع کرنیکا مجاز نہ سمجھے، کسی کو شارع اور قانون ساز نہ مانے، اور اُن تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کردے جو ایک اللہ کی اطاعت کے ماتحت اور اس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں، کیونکہ اپنے ملک کا ایک ہی جائز مالک، اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے، اسکے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں پہنچتا۔

نیز اس عقیدہ کو قبول کرنے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ انسان اپنی آزادی وخود مختاری سے دست بردار ہوجائے، اپنی خواہش نفس کی بندگی چھوڑ دے، اور اللہ کا بندہ بنکر رہے جسکو اس نے الٰہ تسلیم کیا ہے۔ اپنے آپکو کسی چیز کا مالک مختار نہ سمجھے، بلکہ ہر چیز حتی کہ اپنی جان، اپنے اعضاء، اور اپنی ذہنی وجسمانی قوتوں کو بھی اللہ کی ملک اور اسکی طرف سے امانت سمجھے۔ اپنے آپکو اللہ کے سامنے ذمہ دار وجواب دہ سمجھے اور اپنی قوتوں کے استعمال اور اپنے برتاؤ اور تصرفات میں ہمیشہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھے کہ اسے اللہ کو ان سب چیزوں کا حساب دینا ہے۔ اپنی پسند کا معیار اللہ کی پسند کو اور اپنی ناپسندیدگی کا معیار اللہ کی ناپسندیدگی کو بنائے۔ اللہ کی رضا اور اسکے قرب کو اپنی تمام سعی وجہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھیرائے۔ اپنے لیے اخلاق میں، برتاؤ میں، معاشرت اور تمدن میں، معیشت اور سیاست میں، غرض زندگی کے ہر معاملہ میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت، اور صرف اسکے مقرر کئے ہوئے ضابطہ کو ضابطہ تسلیم کرے، اور ہر اس طریقہ کو رد کردے جس کا اللہ کی طرف سے ہونا ثابت نہ ہو۔

اس عقیدہ کے دوسرے جزء یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سلطانِ کائنات کی طرف سے روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبی کے ذریعے سے مستند ہدایت نامہ اور ضابطۂ قانون بھیجا گیا، اور جس کو اس ضابطہ کے مطابق کام کرکے ایک مکمل نمونہ قائم کردینے پر مامور کیا گیا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اس امر واقعی کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ انسان ہر اس[۱] تعلیم اور ہر اس ہدایت کو بے چون و چرا قبول کرے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہو۔ اسکو[۲] کسی حکم کی تعمیل پر آمادہ کرنے کے لیے اور کسی طریقہ کی پیروی سے روک دینے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس چیز کی ممانعت رسول خدا سے ثابت ہے، اسکے سوا کسی دوسری دلیل پر اسکی اطاعت موقوف نہ ہو۔ رسول[۳] خدا کے سوا وہ کسی کی پیشوائی و رہنمائی تسلیم نہ کرے، دوسرے انسانوں کی پیروی صرف اس حد تک ہو جس حد تک وہ رسول خدا کے پیرو ہوں، اور صرف اُن معاملات میں ہو جن میں اُنکے طریقہ کا کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ سے ماخوذ ہونا ثابت ہو جائے۔ وہ[۴] اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں خدا کی کتاب اور اسکے رسول کی سنت کو حجت اور سند اور مرجع قرار دے، جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ وہاں سے ثابت ہو اسے اختیار کرے، جو وہاں سے ثابت نہ ہو اُسے ترک کر دے، اور جو مسئلہ بھی حل طلب ہو اُسے حل کرنے کے لیے اُسی سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔ تمام[۵] عصبیتیں اپنے دل سے نکال دے خواہ وہ شخصی ہوں یا خاندانی یا قبائلی و نسلی، یا قومی و وطنی، یا فرقی و گروہی، کسی کی محبت یا عقیدت میں بھی ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسول خدا کے لائے ہوئے حق کی محبت و عقیدت پر وہ غالب آجائے یا اسکی مد مقابل بن جائے۔ رسول[۶] خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی ذہنی غلامی میں مبتلا نہ ہو، ہر ایک کو خدا کے بنائے ہوئے اُس معیار کامل پر جانچے اور پرکھے اور جو اُس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہو اسکو اُسی درجہ میں رکھے۔

نصب العین

۴- جماعت اسلامی کا نصب العین اور اسکی تمام سعی و جہد کا مقصود دنیا میں، حکومت الٰہیہ کا قیام، اور آخرت میں رضائے الٰہی کا حصول ہے۔

تشریح:۔ جہاں تک امر تکوینی کا تعلق ہے، اللہ تعالیٰ کی حکومت آپ اپنے زور پر قائم ہے اور اس سے بالاتر ہے کہ معاذ اللہ اُس کا قیام و بقا بندوں کی مدد کا محتاج ہو۔ تمام مخلوقات خواہ ارضی ہوں یا سماوی، اسکے قہر و غلبہ سے مغلوب ہیں، اسکے زبردست قانون کی بندش میں جکڑی ہوئی ہیں، کسی میں اسکے حکم سے سرتابی کا یارا نہیں، اور دوسری مخلوقات کی طرح انسان بھی، خواہ مومن ہو یا کافر، اللہ کی تکوینی حکومت کے ماتحت محض ایک بندۂ مجبور ہے۔ لہذا حکومت الٰہیہ کے قیام سے مراد اللہ کی تکوینی حکومت کا قیام نہیں ہے، بلکہ دراصل اس سے مراد اللہ کی شرعی حکومت کا قیام ہے جسکا تعلق صرف انسان سے ہے، اور انسان کی زندگی کے بھی اُس حصہ سے ہے جس میں اللہ نے انسان کو اختیار عطا کیا ہے۔

انسان کی زندگی کا جو حصہ حیوانی و طبعی ہے اسکو تو اللہ تعالیٰ نے حکم تکوینی کے ماتحت رکھا ہے اور اس حصہ میں انسان دوسری تمام مخلوقات کی طرح بہر حال مسلم (مطیع) ہے، مگر جو حصہ انسانی ہے، یعنی جس میں انسان عقل اور تمیز استعمال کر کے خود اپنے ارادہ سے کام کرتا ہے، اس میں اللہ نے اسے آزادی عطا کی ہے کہ چاہے خود مختار بنکر کام کرے، چاہے اللہ کے سوا کسی اور کا بندہ بن جائے، چاہے خود خدائی کا مدعی بنکر دوسروں کو اپنا بندہ بنائے، اور چاہے تو اپنے اصلی مالک کو پہچان کر برضا و رغبت اسکی بندگی اختیار کرلے۔ یہ آزادی جو اللہ نے انسان کو عطا فرمائی ہے اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ آدمی ان چاروں صورتوں میں سے جو صورت بھی اختیار کرے وہ یکساں جائز اور حق ہے۔ نہیں، اس انتخاب و اختیار میں آدمی کو آزاد چھوڑنے کا مدعا دراصل امتحان اور آزمائش ہے۔ جائز اور حق تو صرف یہی ہے کہ انسان اپنی زندگی کے اختیاری حصہ میں بھی اسی طرح اپنے خالق کا مطیع ہو جس طرح وہ اپنی زندگی کے غیر اختیاری حصہ میں اسکا مطیع ہے، کیونکہ حقیقت میں وہی ایک جائز فرمانروا ہے اور اسی کی اطاعت کائنات کے مجموعی نظام کے ساتھ صحیح مناسبت رکھتی ہے۔ لیکن اللہ نے اس حق پر انسان کو مجبور کرنے کے بجائے اُسے آزاد چھوڑ دیا ہے

تاکہ اگر وہ اس حق کو پہچانے اور آزادی رکھنے کے باوجود خود اپنی خوشی سے بندگی کا طریقہ اختیار کرے تو اسے ابدی انعام سے سرفراز کیا جائے، اور اگر وہ اسے نہ پہچانے یا پہچاننے کے باوجود خواہشات نفس کا ایسا غلام ہو کہ مالک حقیقی کی اطاعت گوارا نہ کرے تو اسکو ابدی سزا دی جائے۔

چونکہ اس امتحان و آزمائش کی غرض سے اللہ نے انسان کو خود آزادی عطا فرمائی ہے اس لیے وہ اپنی فرمانروائی کا حق تسلیم کرانے کے لیے اپنی اُس قاہرانہ طاقت سے کام نہیں لیتا جسکو وہ اگر چاہتا تو پہلے ہی استعمال کرسکتا تھا اور چاہے تو ہر وقت استعمال کرسکتا ہے۔ جبر و زور سے مغلوب کرنیکے بجائے وہ حجت و برہان کے ساتھ نصیحت اور فہمائش کرنے کا طریقہ اختیار کرتا ہے، اور انسان کو سمجھاتا ہے کہ در حقیقت زمین و آسمان کا مالک میں ہوں، تو میری مخلوق اور میری رعیت ہے، اور تیرے لیے بھلائی اسی میں ہے کہ جو امر واقعی ہے اسکو تسلیم کرکے تو میرا مطیع فرمان بندہ بن جائے۔ اس فہمائش کے کام میں اللہ نے سب سے پہلے تو اُن انسانوں سے مدد لی ہے جنکو اس نے اپنا رسول مقرر کیا تاکہ وہ دلائل سے انسان کو حقیقتِ نفس الامر یعنی اللہ واحد ہی کے تنہا مالک و مدبر کائنات اور حاکم ذی اقتدار ہونیکا یقین دلائیں اور بطوع و رغبت اسکی اطاعت اختیار کرنے پر راضی کریں۔ پھر جو انسان رسولوں کی فہمائش سے حقیقت کو جان گئے ہوں اور جان کر اسکے پیرو بن چکے ہوں اُن سے اللہ مطالبہ کرتا ہے کہ تم اس کام میں میری مدد کرو۔ چنانچہ قرآن میں بار بار فرمایا گیا ہے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا أَنصَارَ اللَّهِ (اے ایمان لانے والو! اللہ کے مددگار بنو) إِن تَنصُرُوا اللَّهَ يَنصُرْكُمْ (اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ تمہاری مدد کریگا) وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ (اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کون اسکی اور اسکے رسولوں کی مدد کرتا ہے، درانحالیکہ اللہ پردۂ غیب میں چھپا ہوا ہے) وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ (اور اللہ ضرور ہی اسکی مدد کریگا جو اللہ کی مدد کریگا)۔

پس اللہ کی حاکمیت کا اقرار کرکے اور اسکی بندگی اختیار کرکے مومن کا کام ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اسکے بعد یہ خدمت اسکے سپرد کی جاتی ہے کہ وہ جاہل انسانوں کو اسی حقیقت سے واقف کرائے جس سے وہ خود واقف

ہوا ہے، اور باغی انسانوں کو اُسی حاکم اعلیٰ کی اطاعت پر آمادہ کرے جس کا وہ خود مطیع بنا ہے۔ اسی خدمت کی انجام دہی میں اللہ کی رضا ہے، اور اسی کے لیے اللہ اور مومن کے درمیان وہ معاہدہ عمل میں آتا ہے جسکی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ:۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ
اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۚ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ
وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ۚ وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ
فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ۚ وَذٰلِكَ
هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ (التوبہ - ۱۴)

درحقیقت اللہ نے (اپنے کام کے لیے) مومنوں سے انکی جانوں اور انکے مالوں کو خرید لیا ہے جسکے معاوضہ میں انکے لیے جنت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں (اور اس لڑائی میں) مارتے بھی ہیں اور مارے بھی جاتے ہیں (اسکے معاوضہ میں جنت کا) وعدہ اللہ کے ذمہ ہے اور یہ پکا وعدہ ہے جو توراۃ اور انجیل اور قرآن میں کیا گیا ہے اور اللہ سے بڑھکر اپنے وعدہ کو پورا کرنے والا کون ہوسکتا ہے، لہٰذا اپنی اُس بیع پر خوش ہو جاؤ جو تم نے اللہ کے ساتھ طے کی ہے کہ یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔

انسان کی زندگی کے اختیاری حصہ میں اللہ کے جس قانون کی اطاعت مطلوب ہے وہ اسکا قانونِ تکوینی نہیں بلکہ اُس کا وہ قانونِ شرعی ہے جو رسولوں کے واسطے سے آتا ہے اور اس قانون کا تعلق عقائد، اخلاق، معاشرت، تمدن اور سیاست وغیرہ سے ہے محض تکوینی حیثیت سے اللہ کو خالق اور مدبر کائنات اور مالک ارض و سما مان لینا کافی نہیں بلکہ سیاسی حیثیت سے اُسی کو بادشاہ اور حاکم اور قانون ساز ماننا بھی ضروری ہے اور اُسی کے بتائے ہوئے اصول اخلاق اور حدود قانون کی پیروی لازم ہے۔ اگر صرف تکوینی حیثیت سے کوئی اللہ کو مانتا ہو اور لاشریک مانتا ہو، لیکن انسانی زندگی کے اختیاری حصہ میں خود اپنے مختار مطلق ہونے کا دعا کرے، یا زمین کے کسی حصہ پر اپنی حاکمیت کا مدعی ہو اور کہے کہ یہاں میں اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہونگا حکم چلاؤنگا جیسا کہ نظامِ بادشاہی میں ہر بادشاہ، نظام آمریت میں ہر ڈکٹیٹر، نظام برہمنی و پاپائی میں ہر مذہبی پیشوا، نظام جمہوری میں جمہوریت کا ہر شہری کہتا ہے، اور جیسا کہ انفرادی زندگی میں ہر اُس شخص کا نفس کہتا ہے جو خدا کی اطاعت کا قائل نہ ہو،

(بقیہ بر صفحہ ۷۳)

اسلام کا سیاسی نظریہ اور فلاحِ عالم

از جناب حکیم محمد اسحاق صاحب سندیلوی

(۲)

آمریت | زمانہ قدیم کی مطلق العنان بادشاہت اور جمہوریت کے مجموعہ کا نام آمریت ہے۔ اسلیے یہ دونوں کے معائب کی حامل ہے۔ بادشاہی کے معائب کا اقرار تو اب ہر شخص کو ہے اسلیے انکے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔ اور جمہوریت کے عیوب انشاءاللہ آئندہ سطور میں تحریر کیے جائینگے۔ حیرت اُن مدعیانِ عقل و دانش پر ہے جو ایک طرف آمریت کے ایسے مہمل نظریہ کو تسلیم کرتے ہیں اور دوسری طرف اسکے بھی مدعی ہیں کہ ہم انسانیت کی قدر و قیمت پہچانتے ہیں اس سے بڑھکر انسانیت کی توہین اور کیا ہو سکتی ہے کہ انسانوں کی ایک بہت بڑی جماعت خود اپنے ہی جیسے ایک انسان کے ہاتھ میں بالکلیہ اپنی باگیں دیدے۔

چونکہ آمریت عقل اور فطرت کے خلاف چیز ہے اسلیے یہ کبھی معمولی حالات میں پیدا نہیں ہوتی بلکہ اُن غیر معمولی حالات میں پیدا ہوا کرتی ہے جبکہ مصائب کے کسی شدید حملہ نے ایک قوم کے دماغی توازن کو بگاڑ دیا ہو۔ ایسے موقع پر اگر کوئی ہوشیار آدمی موجود ہوتا ہے تو وہ قوم کی بدحواسی سے فائدہ اٹھا کر عام جذبات میں اشتعال پیدا کرتا ہے، امیدوں کے سبز باغ دکھاتا ہے، اور اس طرح توجہات کو اپنے اوپر مرکوز کر کے آمرانہ اقتدار حاصل کر لیتا ہے۔ اسکے ساتھ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اگر قوم کے حواس برجا ہو گئے اور اسے سوچنے کی مہلت مل گئی تو اسکی آمریت

ختم ہو جائیگی - یہی وجہ ہے کہ ہر آمر اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے پیہم ہیجان انگیز کارروائیاں کرتا رہتا ہے تاکہ اسکی قوم کو کبھی سکونِ قلب کے ساتھ غور و فکر کا موقع ہی نہ ملے، اور یہی وجہ ہے کہ دُنیا کے کل ڈکٹیٹروں کی تاریخ خونریزیوں اور لڑائیوں سے بھری ہوئی نظر آتی ہے - اسکا نتیجہ علاوہ خونریزی، بدامنی اور بے اطمینانی کے یہ بھی ہوتا ہے کہ سوسائیٹی میں عقلِ سلیم کا نشوونما رک جاتا ہے اور لوگوں میں اسکی صلاحیت ہی نہیں رہتی کہ معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کر سکیں ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جماعت کی فکری ہی نہیں بلکہ اخلاقی زندگی بھی تباہ و برباد ہو جاتی ہے -

علاوہ بریں آمریت کے نظام میں جماعت کا اخلاق شخصی اخلاق کے تابع ہو کر شخصی ہو جاتا ہے اور اس میں صرف آمر کی زندگی کا نمایاں خلق غالب ہو جاتا ہے - حالانکہ قوام تمدن اور مزاج تہذیب کے قیام و بقا کے لیے یہ ضروری ہے کہ مختلف اشخاص کے مختلف اخلاق و اوصاف جماعت میں نشوونما پاتے رہیں تاکہ جماعت کا اجتماعی مزاج اعتدال سے تجاوز نہ کر جائے، جماعت زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر سکے، اور اسکا کیرکٹر یک طرفہ (ONE SIDED) ہو کر نہ رہ جائے -

تاریخ شاہد ہے کہ آمریت جماعت کو جس سرعت کے ساتھ ایک ناپائدار ظاہری ترقی کی طرف لے جاتی ہے اس سے وہ چند زیادہ سرعت کے ساتھ وہ اسکو تنزل و ادبار کی طرف لیجاتی ہے - اسکی وجہ یہی ہے کہ وہ جماعت کے اجتماعی مزاج کو غیر معتدل بنا کر اسکی اخلاقی و فکری بنیادوں کو کھوکھلا کر دیتی ہے اسلیے اسکی ترقی ہی اسکے تنزل و ادبار کا سبب بنجاتی ہے - بلکہ درحقیقت اسکی ترقی تنزل بصورت ترقی ہوتی ہے اور اسکا عروج بالکل اُس سُرخی کی طرح ہوتا ہے جو مریضِ دق کے چہرے پر نمایاں ہو جاتی ہے اور تیمارداروں اور خود مریض کو افزائش تندرستی و قوت کا فریب دیتی ہے -

مزید یہ کہ آمر ہمیشہ ایسے افراد کو ابھرنے سے روکتا رہتا ہے جو اپنی قابلیت کی وجہ سے

اسکے مدِ مقابل ہو سکتے ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو افراد میں اپنی فطری قوتوں کو نشو و ترقی دینے کا جذبہ دب جاتا ہے اور دوسری طرف جماعت ایسے اشخاص کی اعلیٰ صلاحیتوں کے فوائد سے محروم ہو جاتی ہے۔

جمہوریت دنیا کے سیاسی نظریوں میں جس قدر پُر فریب اور پُر تلبیس نظریہ جمہوریت ہے اس قدر کوئی بھی نہیں ہے۔ بظاہر یہ ایک جنت ہے جس میں خوف اور حزن کا نام و نشان بھی نہیں ہے، جس میں شخصی آزادی کی حفاظت ہوتی ہے، جس میں انسانیت کی قدر و قیمت پہچانی جاتی ہے اور جس میں عزت و امارت کا کوئی سوال باقی نہیں رہتا۔ لیکن جب اسکے باطن پر نظر کی جائے تو یہ ایک جہنم نظر آتی ہے جس میں تکالیف اور پریشانیاں بھری پڑی ہیں جس میں انسانیت کو کُند چھری سے ذبح کیا جاتا ہے، جس میں شخصی آزادی کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور جس میں غریب اور کمزور کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ جمہوریت کے تمام معائب کو یہاں مفصل طور پر بیان کرنا مشکل ہے، مگر اس کی چند نمایاں خرابیاں ذیل میں درج کی جاتی ہیں جن سے اس فردوس نما دوزخ کی حقیقت معلوم کی جا سکتی ہے:

(۱) جمہوریت کا طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اس میں اجتماعی ارادہ (General Will) کی فرمانروائی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن یہی چیز جمہوریت کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اجتماعی ارادہ کسی مستقل اور پائیدار چیز کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک بڑی لوچ دار چیز ہے جو ہر پُر زور چیز سے دباؤ کھا کر اپنی شکل بدل دیتی ہے۔ اسکو دھوکا دیا جا سکتا ہے، اسکو لالچ دلایا جا سکتا ہے، اس کو مشتعل کیا جا سکتا ہے، اس کو بسا اوقات نہایت معمولی اسباب بھی متغیر کر دیتے ہیں۔ ایسی غیر مستقل چیز پر جس ریاست کی بنیاد قائم کی جائیگی اس میں استقلال اور پائداری کبھی نہیں پائی جا سکتی۔

(۲) اجتماعی ارادہ کا ادبی، اخلاقی اور نفسیاتی تاثرات سے متأثر ہونا یقینی ہے۔ ایسی حالت

ہیں ریاست کے لیے کوئی مستقل اخلاقی معیار اور قانون کے لیے کوئی پائیدار اخلاقی بنیاد نہیں رہتی اگر جمہور کے اندر برے میلانات نشوونما پانے لگیں تو ریاست اور قانون نہ صرف یہ کہ ان کو روک نہیں سکتے بلکہ وہ اُنکے بقاء و ارتقاء کا ذریعہ بن جاتے ہیں، کیونکہ یہاں ریاست اور قانون دونوں خود جمہور اور انکے میلانات ہی کے تابع ہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ باشندے اگر تباہی کی جانب ایک قدم چلتے ہیں تو ریاست انکو سو قدم دھکیلتی ہے۔ اس طرح انسانیت کی تباہی و بربادی کا راستہ مختصر ہو جاتا ہے۔ کل کی تاریخ اور آج کا مشاہدہ اس چیز کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ بداخلاقی اور بدکرداری نے جمہوریتوں کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ کس طرح ترقی کی ہے، جمہوریتوں نے کس طرح انکو ترقی دینے میں امداد و اعانت کی ہے، پھر کس طرح یہ بداخلاقیاں قوموں کی تباہی و بربادی پر منتج ہوئی ہیں۔ واقعہ صرف یہی نہیں ہے کہ جمہوریت اخلاق عامہ کے بگڑ جانے کے بعد ان اخلاق سیئہ کی اشاعت و اعانت کرتی ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خود جمہوریت اخلاق عامہ کی تباہی و بربادی اور انکی خرابیوں کو وجود میں لانے کا بہت بڑا اور یقینی سبب ہے۔ اسلیے کہ جمہوریت میں درحقیقت اخلاق کا کوئی مستقل معیار ہی نہیں باقی رہتا جسکو سامنے رکھ کر جماعت یا افراد میں اخلاقی حس پیدا کی جائے۔ جمہور کی رائے کو اخلاق کا معیار قرار دیکر یہ امید رکھنا کہ جماعت میں اخلاق حسنہ باقی رہینگے سخت حماقت ہے۔ سوسائٹی کی شرم انسان کو باہر اور کھلم کھلا بداخلاقیوں سے کسی نہ کسی حد تک روک سکتی ہے۔ لیکن خلوت میں روکنے سے وہ قطعاً قاصر ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ تخلیہ میں بداخلاقیوں کا ارتکاب جب ایک معتدبہ جماعت کرتی رہتی ہے تو رفتہ رفتہ بقیہ جماعت بھی اس سے متاثر ہوتی ہے اور مخالفین کی قوت خود بخود کمزور ہو جاتی ہے۔ آخر کار جمہور کے نزدیک بھی اس فعل میں کوئی شناعت باقی نہیں رہتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بداخلاقی خوش اخلاقی بنکر ریاست کی

اعانت و امداد حاصل کر لیتی ہے اور اسکے زیر سایہ پھل پھولکر دوسرے معائب و خبائث کو پیدا کرنیکا سبب بنتی ہے

(۳) جماعتی تعصب اور گروہ بندی جمہوریت کے لیے ایک لازمی و ضروری چیز ہے - اس مہلک مرض کا اثر یہ ہوتا ہے کہ حق گوئی و حق پسندی کا وصف لوگوں میں بالکل مفقود ہوجاتا ہے ایسی صورت میں قوم کی اخلاقی تباہی یقینی ہے - پھر یہی چیز جماعتی استبداد اور اکثریت کے ظلم تک منتج ہوتی ہے جو نظام جمہوری کی بدترین خصوصیت ہے اور جس کی وجہ سے یورپ میں متعدد جمہوریتیں پاش پاش ہوگئی ہیں -

(۴) قانون سازی کے اختیارات جمہوریتوں میں درحقیقت صرف برسر اقتدار جماعت کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر ریاست کی کل جماعتیں قانون بنانے میں حصہ لیتی ہیں - پھر اس برسر اقتدار جماعت میں بھی پارٹی ڈسپلن کا دہانہ ہر ایک کے منہ پر چڑھا ہوتا ہے جسکی وجہ سے حق کا دم انکے حلق میں گھٹ کر نکل جاتا ہے - اسیلیے اول تو اس میں اور آمریت میں کچھ زیادہ فرق باقی نہیں رہتا اور جمہور کا نام محض فریب دینے کے لیے لیا جاتا ہے، دوسرے یہ برسر اقتدار جماعت آخر انسانوں کی جماعت ہوتی ہے، فرشتوں کی جماعت نہیں ہوتی کہ اسلیے اسکے وضع کیے ہوئے قوانین پر اسکے ذاتی رجحانات و تعصبات کا اثر پڑنا لازمی ہے - ایسی صورت میں عدل و انصاف کا معیار اس جماعت کے مفاد کے علاوہ کچھ نہیں رہجاتا - پھر یہ معیار بھی قطعاً غیر مستقل ہوتا ہے، اسلیے کہ جب دوسری پارٹی برسر اقتدار آتی ہے تو معیار اور نقطۂ نظر تبدیل ہوجاتا ہے - ان حالات میں شہریوں اور ریاست دونوں کو "امن و عیش" کہاں نصیب ہوسکتا ہے جب کہ ہر وقت "جرس" "بر بندید محملہا" کی آواز بلند کر رہا ہو -

(۵) طاقتور اور برسر اقتدار جماعت حزب مخالف (Opposition party) کو ہر ممکن طریقہ

سے دبانے کی کوشش کرتی رہتی ہے، اور اسکا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ مخالف پارٹی بھی اول الذکر کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتی ہے۔ اس وجہ سے جمہوریتوں میں باہمی تفرقہ کی آگ ہمیشہ سلگتی رہتی ہے اور اسکا خانہ جنگی تک منجر ہو جانا کچھ بعید نہیں ہوتا۔

(۶) اجتماعی ارادہ چونکہ ایک تغیر پذیر شئے ہے اسلیے جمہوریتیں کبھی مستقل اور پائیدار اصولوں پر نہیں چلتیں بلکہ ان میں تلوّن اور ابن الوقتی کی شان پائی جاتی ہے اجسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نہ دوست ان پر اعتماد کر سکتے ہیں نہ دشمن۔ انکے ساتھ معاملہ کرتے وقت کوئی بھی یہ بھروسہ نہیں کر سکتا کہ آج انکی جو پالیسی ہے کل بھی وہی قائم رہیگی۔

(۷) اگر جمہوریت نظام سرمایہ داری کے ساتھ مخلوط ہو تو یہ ناگزیر ہے کہ حکومت و فرمانروائی صرف سرمایہ دار طبقہ کے قبضہ میں آجائے اور غربا کی قسمت میں ابدی محکومی و غلامی لکھدی جائے۔ اسلیے کہ جمہوریت میں اقتدار اس جماعت کو حاصل ہوتا ہے جسکے پاس پروپیگنڈے کے ذرائع زیادہ ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ چیز دولتمندوں کو غریبوں کی بہ نسبت زیادہ میسر ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ چنانچہ مشاہدہ ہمارے اس بیان کی تائید کر رہا ہے۔ انگلستان میں جو جمہوریت کی محبت میں درجہ جنون سے بھی آگے بڑھ گیا ہے، محض سرمایہ دار طبقہ کی فرمانروائی ہے اور یہی حال امریکہ اور تمام دوسرے جمہوری ممالک کا ہے۔

(۸) جمہوریت کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اسکے اوپر جس ریاست کی بنیاد رکھی جاتی ہے اسکی پالیسی کا محور صرف معاشیات کو بنانا پڑتا ہے۔ یہ ایک لازمی و ضروری چیز ہے جس سے کسی جمہوریت کو مفر نہیں ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی ارادہ جو جمہوری ریاستوں کا طاغوت مسجود ہے انفرادی ارادوں کے اجتماع سے وجود میں آتا ہے اور انفرادی ارادے جب خدا کی بندگی سے آزاد ہوں تو ان کا منتہائے مقصود صرف مطالبات نفس و بدن کا پورا کرنا ہوتا ہے جو معاشیات

کا سرچشمہ ہے۔ اسلیے ہر جمہوریت اس امر پر مجبور ہے کہ وہ معاشی مسائل کو اولیت و اولویت کا درجہ دے اور دوسرے مسائل کو محض انکے تابع سمجھے۔ زندگی کے ہر شعبہ کو معاشیات کے تابع کردینے کا لازمی و لابدی نتیجہ وہ حیوانیت و بہیمیت ہے جسکا مشاہدہ آج دنیا کے اکثر حصہ میں ہو رہا ہے۔ اخلاقی حس کی موت، خدا سے بے نیازی بلکہ بیزاری، مادّہ پرستی کا غلبہ، یہ سب چیزیں اسی شکم پرستی اور عبدیت حرص و ہوس کے ضروری اور لازمی نتائج ہیں جن سے نجات اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ جمہوریت کا وجود دنیا میں باقی ہے اور جب تک معاشیات کے بت کی پرستش اس عالم میں جاری ہے۔ جوزف اسٹالین نے بالکل صحیح کہا ہے کہ "لوگوں کو مذہبی روحانیت سے بیگانہ اور متنفر بنانے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ ان کو معاشیات کی جانب زیادہ سے زیادہ متوجہ کر دیا جائے"

معاشیات کے اس غلبہ کا دوسرا ضروری اور لابدی اثر یہ ہوتا ہے کہ جمہوریت کے ساتھ سرمایہ داری کا ناقابلِ انقطاع رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں ہر جگہ نظام سرمایہ داری اور نظام جمہوری ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں۔ یہ قطعاً ناممکن ہے کہ کسی ملک میں نظام سیاسی جمہوری ہو اور معاشی نظام سرمایہ داری کے علاوہ کچھ اور ہو۔ اسلیے کہ جمہوریت کے معاملہ میں ذیل کی دو صورتوں میں سے کوئی ایک صورت بہر حال ہوگی:

اول یہ کہ جمہوریت کے قیام سے بیشتر نظام سرمایہ داری موجود ہو۔ اس صورت میں یہ یقینی ہے کہ برسر اقتدار جماعت یا تو خود سرمایہ دار ہوگی یا کم از کم سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ہوگی۔ اسکی وجہ ہم سابق میں ذکر کر چکے ہیں اور مشاہدہ بھی اسکی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ انگلستان کے جمہوری نظام میں بینک آف انگلینڈ کے ڈائرکٹر اور وزیر اعظم کی پوزیشن بالکل یکساں ہے بلکہ دستوری قانون کے ماہرین کی ایک بہت بڑی جماعت ڈائرکٹر کے عہدہ کو وزیر اعظم

کے عہدہ سے اہم تر خیال کرتی ہے۔ اسی طرح فرانس کے بینک (Banque de France) کا ڈائرکٹر فرانسیسی حکومت پر اس طرح حاوی رہتا ہے کہ حکومت اسکے اشارہ چشم وابرو کے خلاف کچھ بھی نہیں کرسکتی۔ حکومت اگر اس سے نہیں نباہ سکتی تو اسے مستعفی ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ قریبی دور کی فرانسیسی تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ فرانسیسی کابینۂ حکومت میں روز روز کے تغیرات و انقلابات کس حد تک اسی بینک کے رہین منت رہے ہیں۔ بلکہ جرمنی کے مقابلہ میں فرانس کی موجودہ بے دست و پائی بھی اسی سرمایہ پرستی کی برکت ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جمہوریت کے قیام کے وقت نظام معاشی سرمایہ دارانہ نہ ہو بلکہ کوئی اور مثلاً اشتراکی ہو۔ ایسی صورت میں بھی یہ لازمی ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد نظام معاشی رفتہ رفتہ متغیر ہو کر سرمایہ دارانہ ہو جائے۔ اسلیے کہ اس صورت میں جو جماعت بھی جمہوریت میں برسرِ اقتدار ہوگی وہ سرمایہ پر پورا قبضہ رکھیگی اور اس میں ایسے تصرفات کریگی جو اسکے مفاد کے مناسب ہوں۔ اگر شخصی سرمایہ داری نہ بھی ہو تو جماعتی سرمایہ داری تو یقینی ہے جو شخصی سرمایہ داری سے بھی زیادہ مضر ہے۔ پھر معاشیات سے واقفیت رکھنے والے سمجھ سکتے ہیں کہ جماعتی سرمایہ داری ایک عرصہ کے بعد شخصی سرمایہ داری میں ضرور تبدیل ہو جاتی ہے اشتراکیت کے گہوارہ روس کی مثال ہمارے سامنے ہے جہاں سرمایہ داری کئی صورتیں بدل کر شخصی صورت میں واپس آگئی ہے۔

اس خالص معاشی ریاست وسیاست کے تباہ کن اثرات کا احاطہ مشکل ہے اس سے جو اخلاقی بربادی ہوتی ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن اسکا ایک نتیجہ عجیب و غریب ہوتا ہے جسکا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ یہ خود اس جمہوریت وریاست

کی بنیاد بھی کھوکھلی کردیتی ہے جو اسکو وجود عطا کرتی ہے۔ قارونیت کا غلبہ انسان سے انسانیت کا جوہر سلب کر لیتا ہے۔ ایک سرمایہ دار کو صرف سرمایہ عزیز ہوتا ہے، نہ اسکو قوم کی پروا ہوتی ہے، نہ ملک کی نہ جماعت کی، اسلیے وطنیت و قومیت کے وہ تصورات جن پر عموماً جمہوریت کی بنیاد قائم ہوتی ہے سرمایہ دار کے ذہن سے قطعاً محو ہو جاتے ہیں، اور وہ ہر اس چیز کی اعانت و امداد کرتا ہے جس سے اسکے سرمایہ کی ترقی و حفاظت ہوتی ہو، خواہ اسکے نتیجہ میں ریاست، ملک، قوم سب تباہ و برباد ہو جائیں۔ انگلستان کا مشہور اہلِ قلم جان گنتھر اپنی کتاب "باطن یورپ" (Inside Europe) میں لکھتا ہے "فرانسیسی سپاہی کے سینہ میں جرمنی کی جانب سے جو گولی آکر لگی ہے بہت ممکن ہے کہ وہ فرانس ہی کے کسی کارخانہ کی بنی ہوئی ہو" موجودہ جنگ کے متعلق قریبی زمانہ میں ایک خبر یہ بھی آئی تھی کہ جرمنی نے فرانس کے مقابلے میں جو بھاری ٹینک استعمال کئے تھے ان میں سے ایک بہت بڑی تعداد خود فرانس کے بنے ہوئے ٹینکوں کی تھی۔ مسٹر چیمبرلین آنجہانی کی پالیسی جس نے جنگ کو برطانیہ کے لیے اس قدر تباہ کن بنا دیا اور جرمنی کی ہمتوں کو اسقدر بلند کر دیا اسی سرمایہ پرستی کا نتیجہ تھی۔ پولینڈ کے مقابلہ میں جرمنی کی اسقدر عاجل کامیابی اور پولینڈ کی تباہی کی ذمہ دار بھی وہاں کی سرمایہ پرست جماعت ہے جس کو جرمنی کی غلامی میں سرمایہ بڑھانا بہ نسبت آزادی کے زیادہ پسند آیا۔

(۹) اجتماع کے وجود میں آنیکے دو سبب ہوتے ہیں: کوئی عقلی اصول جو کل جماعت کا مقصد و مطمح نظر ہو جائے اور یہ مقصد و عقیدہ کی ہم آہنگی پوری جماعت کو متحد و مجتمع کر دے یا کوئی خاص جذبہ جو افراد میں ہم آہنگی پیدا کر کے ان میں ایک ہیئت اجتماعیہ کو وجود میں لانیکا سبب بنے۔ جمہوری ریاست میں چونکہ اصول کا معیار خود اجتماع ہے اسلیے اسکے سامنے کوئی

ایسا مستقل عقلی اصول وقانون نہیں ہوتا جو افراد میں ہئیت اجتماعیہ پیدا کر کے جمہوریت کے وجود میں آنیکا سبب بنے۔ لہٰذا یہ لازم آیا کہ اس میں اجتماع کی بنیاد عقلی کے بجائے محض جذباتی ہو جسکے مندرجہ ذیل نتائج یقینی ہیں:

(الف) جماعت میں عقلیت کے بجائے جذباتیت پیدا ہو جاتی ہے جس سے اسکے قوائے عقلیہ روز بروز کمزور ہوتے جاتے ہیں۔ نہ اسکا فکری نظام صحیح رہتا ہے نہ اخلاقی۔ اور رفتہ رفتہ وہ حیوانیت وبہیمیت کے درجہ پر پہنچ کر فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔

(ب) جذبات میں استقلال نہیں ہوتا اسلیے یہ اجتماع بھی سخت متلوّن اور سیماب وش ہوتا ہے۔ یورپ کی جمہوریتوں میں روز روز کے تغیرات وانقلابات اسکی نظیر میں پیش کیے جا سکتے ہیں یہانتک کہ انگلستان کا ایسا قدامت پسند اور جامد ملک بھی چھوٹے موٹے انقلابات کی آماجگاہ تو بن چکا ہے اور ایک بڑے انقلاب کی جانب بھی قدم بڑھا رہا ہے جیسا کہ وہاں کے ارباب سیاست کے اقوال سے باوجود سعی اخفا معلوم ہوتا ہے۔

(ج) جمہوریت میں ایک جماعت محض اس بنا پر دوسری جماعت پر صاحب اقتدار بنا دی جاتی ہے کہ وہ ثانی الذکر سے تعداد میں زیادہ ہے۔ یہ چیز جس قدر انصاف وعدل کے خلاف ہے وہ ظاہر ہے عقل سلیم کسی صورت سے بھی یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہو سکتی کہ محض تعداد کی اکثریت حکمرانی وفرمانروائی کا حق پیدا کر دیتی ہے۔

تلک عشرۃ کاملۃ۔ مشتے نمونہ از خروارے۔ صرف ان دس معائب کے اظہار پر اکتفا کرتا ہوں، ورنہ جمہوریت کی خرابیاں اس سے کہیں زائد ہیں۔ اب میں ان لوگوں سے پوچھتا ہوں جو "اسلامی جمہوریت" کی لایعنی اصطلاح بڑے زور سے استعمال کیا کرتے ہیں کہ اسی پر از معائب جمہوریت کو آپ اسلام کے سر تھوپنا چاہتے ہیں؟ اور اگر یہ نہیں ہے

بلکہ جمہوریت سے آپ کوئی دوسرا مفہوم مراد لیتے ہیں تو کیا ضرورت ہے کہ آپ اسی لفظ کو اسلام کے ساتھ ملا کر گمراہ کرنے کا سبب بنیں۔ کیا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا الخ کا حکم محض لفظ "راعنا" ہی کے استعمال تک محدود ہے؟ اور کیا یہ تلبیس الحق بالباطل نہیں ہے؟

جمہوریت، آمریت، اشتراکیت وغیرہ یہ سب خالص دنیاوی ریاست (Seculat State) کی قسمیں اور انسانی فرمانروائی (Human Sovereignty) کی مختلف صورتیں ہیں۔ انکو اسلامی ریاست اور خلافت الٰہیہ سے کیا نسبت جسکی بنیاد ہی انسانی حکومت کی نفی اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا اثبات ہے۔ اسلیے اسلامی ریاست کی نظیر تلاش کرنا نہ صرف عبث بلکہ سخت گمراہی و ضلال بھی ہے۔ مگر ان مرعوب و ماؤف ذہنوں اور دماغوں کو کیا کہا جائے جنھوں نے اسلامی مسائل کی حقانیت کا معیار مغربی خیالات سے انکے انطباق کو قرار دیدیا ہے۔ پھر اس کوشش میں واقعیت و غیر واقعیت سے انکو کیا بحث۔ اسلامی مسئلہ خواہ وہ مغربی اصول سے قطعاً متضاد ہی کیوں نہ ہو، اور مغربی مسئلہ خواہ کتنا ہی لغو و مہمل کیوں نہ ہو مگر انکا تو کام بس اتنا ہے کہ اسلام کو کھینچ تان کر اس پر منطبق کردیں، خواہ اس کوشش میں اسلام کے ٹکڑے ہی کیوں نہ اڑ جائیں۔ اس چیز کا نام انکے نزدیک مغربی سیاست سے واقفیت اور جدید علم کلام میں مہارت ہے۔

میں ان لوگوں سے کہتا ہوں کہ بیشک آپکو اسکا حق حاصل ہے کہ اپنا جو مسلک چاہیں اختیار کریں۔ لیکن آپکو یہ حق کہاں سے پہنچتا ہے کہ آپ اپنے ذاتی رجحانات و خیالات کو اسلام کی جانب منسوب کردیں؟ پھر اگر صحیح اسلامی خیالات آپکے نزدیک موجودہ دور میں ظاہر کرنے کے قابل نہیں ہیں اور آپ کو انکے اظہار سے شرم آتی ہے تو آپ صاف صاف اسلام سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیوں نہیں کرتے؟ اخلاقی جرأت اور دیانت کا اقتضاء تو یہی ہے۔

اگر آپ اسلام سے شرماتے ہیں تو اسلام آپ سے سو بار شرماتا ہے۔ اسکو کوئی پرواہ نہیں خواہ اسکا کوئی پیرو رہے یا نہ رہے۔ وہ خود ایک زندہ حقیقت ہے۔ اسکی زندگی ہمارے وجود کی محتاج نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی اسکے وجود کی محتاج ہے۔ اللہ اللہ مسلمانوں کے علماء تک کی اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ وہ اسلامی خیالات کو صحیح صورت میں ظاہر کرتے ہوئے شرماتے ہیں اور انکو کفر و ضلال کے ساتھ آمیز کرنا چاہتے ہیں۔ میں ان سے پھر کہتا ہوں وَلَا تَلْبِسُوا الحق بالباطل و تکتموا الحق و انتم تعلمون ۔

غیر جمہوری سرمایہ دارانہ ریاست پر گفتگو اس موقع پر لاحاصل ہے اسلئے کہ اسکی قباحت اظہر من الشمس ہو چکی ہے۔ نیز جمہوری سرمایہ دارانہ نظام کے قبائح پر جو روشنی ڈالی جا چکی ہے اسکے بعد اس موضوع پر الگ مستقل بحث کی حاجت نہیں۔

اشتراکی ریاست اسوقت جو غیر اسلامی نظریہ سب سے زیادہ گمراہی کا سبب بن رہا ہے وہ اشتراکیت ہے۔ اسکا اضلال اس حد پر پہونچ گیا ہے کہ اب دینِ ابراہیمی و ملتِ حنیفی کے محافظین تک اسکے شکار ہو رہے ہیں اور بے سوچے سمجھے اس خلاف عقل و نقل نظام کی تائید میں کوشاں ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ قیامت کے دن، جس پر انکا بھی ایمان ہے، جب ان سے یہ پوچھا جائیگا تو اسکا کیا جواب ان کے پاس ہوگا کہ کیا تم اسلام کو دین کامل نہ سمجھتے تھے؟ پھر کیا اسلام اور کفر کے علاوہ دنیا میں کوئی تیسری چیز بھی تھی؟ پھر جب تم نے اسلام کے سیاسی و معاشی نظام سے روگردانی کرکے ایک دوسرے نظام کو پسند کر لیا تو یہ ترجیح کفر علی الاسلام اور رضا بالکفر تھی یا نہیں؟ پھر رضا بالکفر اور ترجیح کفر علی الاسلام کا حکم تم کیا نہیں جانتے تھے؟ تم خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کی گمراہی کا سبب بنے کیا اسکا انجام تم کو معلوم نہ تھا؟ قسم ہے مالکِ عرش بریں کی ان سوالات کا کوئی جواب انکے پاس نہ ہوگا۔

اس سے پیشتر میں ترجمان القرآن کے صفحات میں ایک مبسوط مقالہ اشتراکیت پر لکھ چکا ہوں جس میں واضح دلائل سے اس نظریہ کا ابطال کیا گیا تھا، اسلیے یہاں اس پر زیادہ تفصیلی گفتگو کی تو کوئی حاجت نہیں ہے۔ البتہ کچھ مزید دلائل یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ان دلائل کو سمجھنے کے لیے یہ ذہن نشین کرلینا ضروری ہے کہ اشتراکیت درحقیقت ایک معاشی نظریہ ہے اور مارکس نے اسکو اسی صورت میں پیش کیا تھا۔ لینن نے اس کی پیشینگوئی کو ایک سیاسی انقلاب کے ساتھ آمیز کرکے اس میں سیاست کی بو پیدا کردی۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ اس کی سیاسی حیثیت کو ہم کسی حالت میں بھی اسکی معاشی حیثیت سے جدا کرسکیں۔ اسکی سیاسی حیثیت اسکی معاشی حیثیت پر موقوف ہے، اسلیے معاشی حیثیت کے انہدام کے بعد سیاسی حیثیت خود بخود فنا ہوجاتی ہے۔

اشتراکیت محنت و سرمایہ کو ایک ہی طبقہ کی ملکیت میں دیدیتی ہے، اور وہ طبقہ بھی محض جماعتی حیثیت سے سرمایۂ دولت کا مالک ہوتا ہے، ورنہ جماعت کا کوئی فرد حقوق ملکیت نہیں رکھتا بلکہ حکومت اس سے محنت لیکر اسکی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے اور وہی کل دولت کی مالک ہوتی ہے۔ اس صورت حال کا یہ نتیجہ لازمی ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد قانون تقلیل افادہ (Law of diminishing utility) کا عمل شروع ہوجائے۔ اس قانون کے اثرات میں آئندہ سطور میں تحریر کرونگا۔ پہلے اس امر کی وضاحت کرتا ہوں کہ اس قانون کا عمل ہونا کیوں ضروری ہے۔

مثال کے طور پر ایک اشتراکی ریاست کے ایک مزدور کے متعلق فرض کیجیے کہ وہ اوسطاً ۸ گھنٹہ روزانہ کام کرتا ہے۔ محنت کی یہ مقدار اسکے لیے حکماً لازمی ہے۔ اور یہ محنت ایسی ہے کہ جس سے اسکی صحت و تندرستی پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور حکومت کے لیے اسکا کام کافی مفید ہوجاتا

ہے - ۸ گھنٹہ کی محنت کا معاوضہ حکومت کی طرف سے اسکو یہ ملتا ہے کہ اسکو اسکی ضروریاتِ زندگی مہیا کر دی جاتی ہیں، مثلاً دو وقت کھانا، صبح کو ناشتہ، گرمی و سردی سے بچنے کے لیے کپڑے - ان ضروریات زندگی کو ہم سہولت کے لیے بصورتِ زر فرض کیے لیتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ اسکو گویا ایک روپیہ روزانہ اجرت ملتی ہے - اب اگر وہ بالفرض ۹ گھنٹہ روزانہ کام کرنے لگے تو بھی اسکو وہی ایک روپیہ روزانہ اجرت ملیگی اسلیے کہ ایک روپیہ کے معنی اسکی ضروریات زندگی کے ہیں، اور ضروریات زندگی محدود ہوتی ہیں، ان میں بڑھنے اور گھٹنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی، اور اگر ہوتی ہے تو برائے نام جو ناقابلِ اعتبار ہے - اس صورت میں کوئی شخص اس پر رضامند نہ ہوگا کہ ۸ گھنٹے کے بجائے ۹ گھنٹہ محنت کرکے خواہ مخواہ تکلیف اٹھائے لہذا سرمایہ کا وہ حصہ جو محنت کرنیوالوں کی ضروریات زندگی سے زائد ہے بالکل فضول ہو جائیگا اور اسکا افادہ ختم ہو جائیگا اسلیے کہ اسکے معاوضہ میں محنت نہیں حاصل کی جاسکتی، نہ اس سے کوئی فائدہ حاصل کیا جاسکتا ہے -

اب فرض کیجیے کہ کسی اشتراکی ریاست کی آبادی ۴۰ ہزار افراد پر مشتمل ہے جنکی محنت کا معاوضہ ایک روپیہ فی کس فی یوم کے حساب سے (عہ = ایک شخص کی ضروریات زندگی) ۴۰ ہزار روپیہ روزانہ ہے - اور ریاست کی آمدنی مثلاً ۵۰ ہزار روپیہ یومیہ ہے تو یہ ۱۰ ہزار روپیہ یومیہ کی بچت بالکل بیکار اور غیر مفید ہے - اس دولت سے محنت کرنے والوں کو کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی اور اسکا افادہ بالکل غائب ہو جائیگا -

اس قانون کے عمل میں آنے کے بعد اشتراکی حکومت ذیل کی دو صورتوں میں سے کوئی ایک اختیار کر سکتی ہے -

پہلی صورت تو یہ ہے کہ وہ اس کل غیر مفید اور زائد از ضرورت دولت کو کل پبلک پر

بحصۂ مساوی تقسیم کردے۔ اس صورت میں چونکہ مختلف اشخاص کی ضروریات زندگی، نیز اخراجات مختلف ہونگے، کسی کے کم ہونگے اور کسی کے زائد، اسلیے معاشی اعتبار سے مختلف طبقات کا پیدا ہوجانا یقینی و لابدی ہے۔ خصوصاً اسلیے کہ محض ضروریات زندگی سے زائد دولت کا تقسیم کردینا اس میں افادہ پیدا کرنیکے لیے کافی نہ ہوگا، بلکہ اسکے لیے پبلک کو تجارت کی اجازت دینا بھی ناگزیر ہوگا۔ نیز یہ کہ تقسیم دولت میں مساوات پیدا کرنے کے لیے اسکو زر کی صورت میں تقسیم کرنا پڑے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس زائد از ضرورت دولت کو تقسیم کرنے کے بجائے خزانہ ہی کی زینت بنایا جائے۔ یہ صورت اول تو سخت احمقانہ اور ظالمانہ ہے۔ دوسرے یہ کہ اس صورت حال کو محنتی طبقہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتا، اسلیے کہ جب وہ دیکھے گا کہ اسی کی محنت سے مہیا کی ہوئی دولت تجوریوں میں مقفل ہے اور وہ برابر محنت و مشقت میں مصروف ہے تو وہ یقیناً اسکے خلاف بغاوت کریگا۔ ہڑتالیں، کارخانوں کو تباہ کرنے کی کوششیں (Sabotage) اور تعطل کی سازشیں شروع ہوکر ریاست کے امن و امان کو خاک میں ملا دینگی۔ اور اس وقت کسی منطق سے انکو اشتراکیت اور سرمایہ داری کا فرق نہ سمجھایا جاسکے گا۔ نیز اس صورت میں ایک اور خرابی بھی لازم آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس فضول دولت کو محفوظ رکھنے کے لیے ناگزیر ہوگا کہ اسکو زر کی صورت میں تبدیل کیا جائے، مگر ظاہر ہے کہ یہ مبادلہ اشتراکی حکومتوں سے تو ہو نہیں سکتا، اسلیے کہ وہ خود اسی قارونیت کی مصیبت میں گرفتار ہونگی، لہذا سرمایہ دار ممالک اور حکومتوں سے معاملہ کرنا پڑیگا۔ پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ اشتراکی حکومت کو تو کسی چیز کی خریداری کی احتیاج ہوگی نہیں اسلیے وہ اس زائد از ضرورت دولت کے معاوضہ میں صرف زر حاصل کریگی یا کم از کم زیادہ سے زیادہ مقدار زر طلب کریگی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ زر کے یک طرفہ اجتماع سے لازماً دونوں ممالک

میں معاشی توازن بگڑ جائیگا۔

اب ایک دوسری حیثیت سے دیکھیے۔ انسان کی ضروریات زندگی محدود ہیں اور انکو پورا کرنے کے لیے کل آدمیوں کو مصروف ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مثلاً سو آدمیوں کی ضروریات پوری کرنیکے لیے زیادہ سے زیادہ پچیس آدمیوں کی ضرورت ہے۔ اس طرح کہ مثلاً دس آدمی غذا مہیا کر سکتے ہیں، ایک آدمی گوشت دیسکتا ہے، ایک آدمی انکے کپڑے سی سکتا ہے، ۲ آدمی انکے لیے کپڑا بن سکتے ہیں، ایک آدمی روشنی کا انتظام کر سکتا ہے، ایک چوکیدار انکی حفاظت کا کام انجام دے سکتا ہے، دو آدمی انکے لیے پانی مہیا کر سکتے ہیں، سات آدمی اور متفرقات کے لیے رکھ لیجیے۔ اس طرح صرف پچیس ۲۵ آدمی سو آدمیوں کی ضروریات زندگی مہیا کرنے کے لیے بالکل کافی ہیں۔ ایسی حالت میں اشتراکی ریاست ان پچھتر فیصدی بیکار اشخاص کے لیے کیا کریگی؟ مجبوراً انکو کام مہیا کرنیکے لیے اسباب تعیش (Luxuries) تیار کرانا ضروری ہونگے اور نہ صرف تیار کرانا ہونگے بلکہ پبلک کو ان کے استعمال کی عادت بھی ڈالنی ہوگی اسکے جو اخلاقی اور نفسیاتی اثرات ہونگے اور یہ جسطرح تباہی و بربادی کی طرف منتج ہوگا وہ بالکل ظاہر ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ اشتراکیت کے لیے دو چیزیں لازمی ہیں جو اسکے وجود سے کبھی منفک نہیں ہو سکتیں۔ اول تو قلیل ہی عرصہ میں اس کا سرمایہ داری میں تبدیل ہو جانا۔ دوسرے اس کا اخلاقی و روحانی بربادی پیدا کرنا۔ پس حیرت و افسوس ہے ان اسیران دام اشتراکیت پر جو اشتراکیت کو دنیا کے لیے آیۂ رحمت سمجھتے ہیں اور اسکو رواج دینے کے لیے کوشاں ہیں اور انما نحن مصلحون کے نعرے لگاتے ہیں۔ میں کہتا ہوں "الا انہم ہم المفسدون ولکن لا یشعرون ہ"۔

نظریۂ خلافت الٰہیہ

ریاست کے غیر اسلامی نظریات مع انکے معائب اور نقائص کے گذشتہ صفحات میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ انکے نقائص اور معائب کو دیکھ کر ہر شخص انکے وجود کو دنیا اور اہل دنیا کے لیے ایک مصیبت عظمیٰ اور لعنت کبریٰ سمجھیگا۔ بلاشبہ دنیا کے اوپر جو مصیبتیں آرہی ہیں وہ زیادہ تر انہیں غلط اور غیر اسلامی افکار سیاسی و اصول معاشی کی رہین منت ہیں۔ ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم دنیا کو ان معائب سے نجات دلانیکا عزم کریں اور اسکے لیے اپنی عمر کا ہر لمحہ اور اپنے خون کا ہر قطرہ وقف کردیں۔ مسلم ہونیکے معنی یہ ہیں کہ ہم نے صرف حق تعالیٰ جل شانہٗ کے احکام کے آگے اپنا سر تسلیم خم کردیا اور صرف اسی کی بادشاہت و سلطنت کو تسلیم کرکے دنیا کے ہر بادشاہ، ہر حاکم، ہر سلطان کی حکومت و سلطنت کی نفی کردی۔ اسلیے یہ ناممکن ہے کہ ہم مسلم ہوتے ہوئے غیر اللہ کی حکمرانی اور غیر اللہ کی حکومت تسلیم کریں، یا غیر اللہ کے بتائے ہوئے کسی نظام حیات اور کسی اصول زندگی کو قبول کرلیں، یا انکے وجود کو جیتے جی گوارا کرلیں۔ نفی کا اقتضاء یہ ہے کہ ہم ہر غیر اسلامی اور غیر الٰہی حاکمیت و فرمانروائی کو صفحۂ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹادیں، اور اثبات کا مقتضی یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حکومت اُسکی زمین میں قائم کریں۔ ان دونوں فرضوں میں سے اگر ایک میں بھی کوتاہی ہو تو یقیناً ہم گنہگار اور سخت گنہگار ہیں، بلکہ ہمارے اسلام میں کمی اور کمزوری ہے۔ یقیناً جس طرح غیر اسلامی نظام حیات اور غیر الٰہی حاکمیت و فرمانروائی کا قبول کرنا اور اسکو رائج کرنیکی کوشش کرنا جرم عظیم اور علامت ضعف ایمان ہے، اُسی طرح اسکے خلاف جدوجہد نہ کرنا اور خاموشی و سکوت کے ساتھ اسکو گوارا کرلینا بھی سخت جرم اور بہت بڑا گناہ ہے۔ پھر خلافت الٰہیہ کے قیام اور اس نظریہ کی قبولیت کے لیے وقت بھی موزوں ترین ہے۔ شاید دنیا کی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا ہے جو خلافت اسلامیہ کی مقبولیت کے لیے موجودہ دور سے زیادہ موزوں و مناسب ہو۔ اسلیے کہ دنیا اس وقت خود

غیر اسلامی نظریات و اصول سے عاجز و پریشان ہے اور بدل متمنی ہے کہ کوئی نیا نظام رواج پذیر ہو کر اسکے مصائب کا خاتمہ کردے اور اسکو راحت و سکون سے ہم آغوش کرے۔ تحریک اسلام کے لیے وقت کی یہ موزونیت و مناسبت ہماری خاموشی و بے عملی کے جرم کو اور بھی سنگین بنادیتی ہے۔

مقام حیرت و غیرت ہے کہ ایک نازی بالکل ناسازگار و ناساعد حالات میں اپنے وطن سے باہر جاکر نازی ازم کا پروپیگنڈا کرتا ہے اور کسی نہ کسی حد تک اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ ایک اشتراکی سرمایہ پرست ممالک میں جاکر اشتراکیت کی تبلیغ کرتا ہے اور کامیاب ہوتا ہے۔ مگر ایک مسلمان اتنے سازگار و مساعد حالات میں بھی زبان سے کلمہ حق نکالتے ہوئے اور نظریۂ خلافت الٰہیہ کی تبلیغ کرتے ہوئے ڈرتا ہے۔ حالانکہ دونوں نظریوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ نازیت، اشتراکیت وغیرہ کل غیر اسلامی نظریات کی حالت یہ ہے کہ انکی بنیادیں کھوکھلی اور کمزور ہیں، انکے فوائد سطحی، وقتی اور قلیل، انکے مضار و معائب بیحد و بیحساب، اور انکا نتیجہ آلام، مصائب، تباہیاں اور پریشانیاں۔ اسکے بالکل برعکس اسلامی نظریہ کی بنیاد مضبوط مستحکم اور ٹھوس منطقی دلائل پر قائم ہے، اسکے فوائد بے حد و حساب، اور مضرت سے اسکا دامن بالکل پاک ہے، اور اس کا نتیجہ دائمی امن و سلام ترقی و خوشحالی ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے لیے اسکی ترویج ضروری ہو جاتی ہے نہ کہ کسی قومی عصبیت کی بنا پر۔ لاریب انتہائی ننگِ انسانیت اور حد درجہ بد دیانتی کا فعل ہوگا اگر ہم بنی نوع انسان کو گوناگوں مصائب دنیوی میں مبتلا اور ہلاکت و عذاب آخرت کی طرف جاتے ہوئے دیکھکر خاموش بیٹھے رہیں اور وہ نسخہ کیمیا ان کو نہ بتائیں جو فلاح و سعادت کا یقینی اور واحد ضامن ہے۔

ذیل کی سطور میں ہم خلافت اسلامیہ کا ایک مجمل خاکہ پیش کرتے ہیں اور دنیا کے ہر اس شخص کو اسکی طرف دعوت دیتے ہیں جس میں انسانیت کا ایک ذرہ بھی باقی رہ گیا ہے۔ خواہ

وہ جرمن ہو یا جاپانی، ترکی ہو یا ایرانی، اطالوی ہو یا برطانوی، ہندو ہو یا بودھ یا عیسائی ہو یا یہودی یا دورِ موجودہ کا نسلی مسلمان خواہ کانگریسی ہو یا مسلم لیگی، ہم سب سے نہایت پُرزور الفاظ میں پورے علم و یقین کے ساتھ کہتے ہیں کہ جمہوریت، نازیت، فاشیت، اشتراکیت وغیرہ کے طلسمات کو توڑ دو اور انسانی حاکمیت کو لات مار کر خدائے واحد قدوس کی حکومت اس عالم آب و گل میں قائم کر کے خلیفۃ اللہ فی الارض کا مرتبہ عظمیٰ حاصل کرو۔ اور یہ سب ہم اپنے کسی ذاتی نفع کے لیے نہیں کہتے، کسی قومی عصبیت، کسی ملکی تعصب، کسی نسلی تفوق کی بناء پر نہیں کہتے، بلکہ محض تمہاری ہی ہمدردی کی بناء پر اور تم کو دنیا کی تباہی اور آخرت کے عذاب الیم سے بچانے کے لیے کہتے ہیں۔ آئندہ تم کو اختیار ہے فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔

ریاست و حکومت کا اسلامی تصور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے دنیا کے کل سیاسی تصورات سے بالکل انوکھا ہے۔ اسلام انسانی حکومت و فرمانروائی کا قائل نہیں ہے بلکہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے اور محض قائم ہی نہیں کرنا چاہتا بلکہ تخلیق انسانی کی غرض و غایت اسی استخلاف فی الارض کو قرار دیتا ہے۔ قولہ تعالیٰ وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً۔ اس طرح وہ انسانیت کی قدر و عزت کو بلند ترین مرتبہ پر پہونچا دیتا ہے۔

اسلام کی روح ارتقاء عروج ہے۔ مگر وہ وہمی اور عارضی ارتقاء نہیں جو غیر مسلمین کا نصب العین اور منتہائے فکر ہے بلکہ وہ ارتقاء جو گہوارہ سے شروع ہو کر عالم آخرت تک جاری رہتا ہے اور جس کی حد و نہایت متعین نہیں ہے۔ غیر اسلام میں ارتقاء و عروج کا تخیل بالکل محدود ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ انسان کی موت تک جاری رہتا ہے لیکن اسلام اسکو غیر محدود بتاتا ہے اور موت کے بعد (جو اسکے نزدیک فنا نہیں بلکہ حیاتِ ثانیہ کا نام ہے) بھی جاری

رہتا ہے۔

انسان اپنے ابتدائے وجود سے ایک راستہ پر گامزن ہوتا ہے جو مختلف منازل سے گذرتا ہوا منزل آخرت کو جاتا ہے۔ یہ راستہ ترقی کا راستہ ہے بشرطیکہ آدمی اسلامی اصول و قوانین کی پابندی کے ساتھ اس پر گامزن ہو۔ اسلامی اصول یہ بتاتے ہیں کہ کس طرح اور کس نیت وغرض سے اس راستہ کی ہر چیز کو استعمال میں لایا جائے تاکہ ہر منزل ترقی وعروج کی منزل بن جائے۔ یہانتک کہ انسان ترقی کے اس اعلیٰ درجہ پر پہنچ جائے جسکا نام جنت ہے، جو اپنے علو و بلندی نیز دائمی و ابدی ہونے کی وجہ سے منتہائے نظر ہونیکا مستحق ہے۔ تمدن وعمران کی ترقی، علوم وفنون کی ترقی، معاشی واقتصادی ترقی، اخلاقی ونفسیاتی ترقی، ذہنی وفکری ترقی، آلاتی و میکانکی ترقی، الغرض وہ کل ترقیاں اسلام کے مقاصد میں داخل ہیں جو حقیقت میں ترقیات ہوں نہ کہ تنزلات، جو انسان کو اوپرلے جائیں نہ کہ نیچے، جو ترقی کے مرتبہ اعلیٰ کے حصول کے لیے ذریعہ بن سکیں نہ کہ اسکی راہ میں حجاب و مزاحم بنجائیں، اور جو فلاح وسعادت کی موجب ہوں نہ کہ خسران وشقاوت کی۔

ترقی وعروج کی ان تمام اقسام کے حصول کے لیے یہ لازمی وضروری ہے کہ انسان کائنات کا صحیح استعمال کرے، ہر چیز کے مفید پہلو سے فائدہ اٹھائے اور مُضر پہلو سے اجتناب کرے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ انسان اپنے صحیح مرتبہ اور دوسری مخلوقات عالم کے صحیح درجہ سے واقف ہو، پھر کچھ ایسے قوانین کا پابند ہو جو تمدن وعمران، معاش واخلاق، ذہانت وتفکر، علم وادراک کے ان منازل ارتقاء کو باقی رکھ سکیں جو انسان کو حاصل ہو چکے ہوں اور ان مراتب کو آئندہ مراتب ارتقاء کے حصول کا ذریعہ بنا سکیں۔

"خلافت الٰہیہ" کا نظریہ ارتقاء عروج کے ان دونوں ضروری عناصر کو مجتمع کر دیتا ہے

انسان کو خلیفۃ اللہ فی الارض قرار دے کر اسلام نے ایک طرف تو کائنات میں انسان کی صحیح حیثیت اور موجودات کے ساتھ اسکے تعلق کی صحیح نوعیت متعین کردی ہے، اور دوسری طرف اسکے لیے موجودات میں تصرف کا صحیح طریقہ بھی معین کردیا ہے، کیونکہ جب انسان اللہ کا خلیفہ ہے تو اسکے معنی یہ ہیں کہ وہ یہاں مالکِ مختار کی حیثیت سے کوئی تصرف کرنیکا مجاز نہیں ہے بلکہ اسے تمام تصرفات اصل مالک کے مقرر کیے ہوئے قانون کے مطابق کرنے چاہییں۔ خلیفۃ اللہ ہونے کے بعد انسان سمجھتا ہے کہ کل کائنات عالم اسکے فائدہ اور نفع کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ اُس کا یقین "وَخَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا" اور "وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ" اور اسی قسم کے دوسرے پیغاماتِ الٰہیہ پر ہوتا ہے۔ اسلیے وہ کائنات کے ذرہ ذرہ پر غائر نظر ڈالتا ہے، عالم خلق کے چپہ چپہ کو کھنگال کر استعمال میں لاتا ہے تاکہ "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا" کے فحویٰ پر عمل ہو جائے۔ پھر وہ اس سب مخلوقات کو ارتقاء کے مرتبہ عظمیٰ یعنی ترقی آخرت کے لیے ذریعہ اور وسیلہ بناتا ہے جسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمدن و عمران، علوم و فنون، فکر و ادراک، غرض ہر میدان میں پیش قدمی کا صحیح رخ متعین ہو جاتا ہے۔

نظریۂ خلافت انسان اور دوسری مخلوقات کے درمیان نوعیت کا فرق قائم کر دیتا ہے۔ دوسری مخلوقات کے لیے صرف قانون طبیعت (Law of Nature) کی پیروی ہے، اور اس پیروی میں ان کے لیے محض جبلّت (Instinct) کی ہدایت کافی ہے۔ لیکن انسان ان کے برعکس خلیفہ یا نائب کی حیثیت رکھتا ہے، اس کو دوسری مخلوق پر تصرف کے اختیارات دیے گئے ہیں، اس کو تمیز اور استدلال اور استنتاج اور تفکر کی قوتیں دی گئی ہیں، اور وہ زمین پر اللہ تعالیٰ کا ذمہ دار و جواب دہ عہدیدار ہے، اس لیے اس کا کام محض تکوینی قوانین اور طبیعی اصول کی پیروی نہیں ہے، بلکہ اُن سے زائد ایک تشریعی قانون، ایک اخلاقی ضابطہ اور ایک جلی ہدایت

کی پیروی کرنا بھی اس پر لازم ہے، بلکہ اسکی فلاح وسعادت کا انحصار اسی دوسری چیز کی پیروی پر ہے۔ اسکی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک حکومت کی سول سروس کا کام محض اُن قوانین کی پیروی کرنا ہی نہیں ہے جو عام رعایا کے لیے بنائے گئے ہوں، بلکہ ان کو حکومت بالادست کی ہدایات اور ضابطۂ ملازمت (Government Servants Conduct Rules) کی پیروی بھی کرنی پڑتی ہے، اور ان کی کامیابی و ترقی کا انحصار دراصل اسی دوسری چیز کی پیروی پر ہوتا ہے۔ پس انسان کے لیے محض قوانین تکوینیہ کی اساس پر سعی و عمل اور ترقی و عروج کا کوئی ایسا پروگرام اور نظام نہیں بنایا جاسکتا جو سفرِ زندگی کی ہر منزل اور حیات کے کل شعبوں میں اسکی رہنمائی کے لیے کافی ہو، اور جسکا اتباع کر کے آدمی ترقی کی دنیوی منزلوں سے سلامتی کے ساتھ گذرتا ہوا آخرت کی انتہائی منازل ترقی تک پہنچ سکے۔ اسکی وجہ صرف یہی نہیں ہے کہ عالم خلق میں سرے سے وہ ضروری مواد Data ہی موجود نہیں ہے جس سے آدمی بطور خود اس پروگرام اور نظام کو اخذ کر سکے، اور اسکی وجہ صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ آدمی کے ذرائع استدلال واستنتاج اس ضابطہ کو معلوم کرنے کے لیے ناکافی ہیں، بلکہ اسکی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سفرِ زندگی کی آخری منزل جس کے نتائج پر ہماری کامیابی وناکامی اور ترقی و تنزل کے اصلی فیصلہ کا دارمدار ہے، ہماری نگاہ سے قطعی اوجھل ہے اور ہم بطور خود کسی طرح بھی یہ نہیں جان سکتے کہ وہاں ہمارے کس دنیوی عمل کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ لہذا خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انسان کو زمین پر اپنے فرائض منصبی انجام دینے کے لیے جس پروگرام اور نظام کی ضرورت ہے وہ لازماً خداوند تعالیٰ کی طرف سے واضح ہدایت یا بالفاظِ دیگر وحی کے طور پر آنا چاہیے۔

اس طرح انسانی ارادہ ارادۂ الٰہی کے، اور انسانی تعقل علمِ الٰہی کے تابع ہو جاتا ہے جسکا ایک اثر تو یہ ہوتا ہے کہ انسان کی قوتِ ارادی اور قوتِ تصرف میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے

کیونکہ ہر قدم پر وہ محسوس کرتا ہے کہ فرمانروائے عالم کی طاقت اسکی پشت پر ہے - دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ ترقی کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے، کیونکہ ہر اساسی اہمیت رکھنے والے مسئلے میں انسان کو صحیح رہنمائی مل جاتی ہے اور اسکی قوت غلط تجربات میں ضائع نہیں ہوتی - تیسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ انسان ان تمام نقصانات سے محفوظ رہتا ہے جو انسانی حاکمیت کے بے اصل مفروضہ پر کام کرنے کی صورت میں لازماً پہنچتے ہیں - اس میں نہ طبقاتی کشمکش ہوتی ہے نہ سرمایہ دار و مزدور کی آویزش نہ پارٹی بندیاں ہوتی ہیں نہ فرقہ پرستیاں، نہ خونریزیاں ہوتی ہیں نہ ہلاکت آفرینیاں، اسلیے کہ یہ سب تو انسانی حکومت کے نتائج ہیں، حکومت الٰہیہ میں انکا وجود کہاں؟ ان خرابیوں کے بالکل برعکس وہاں ایک ایسے تمدن کی تعمیر ہوتی ہے جسکا ہر جزو انتہائی ترقی یافتہ اور جس کا ہر حصہ امن و سلامتی اور راحت و اطمینان کا ضامن ہوتا ہے -

آزادی و مساوات کا حقیقی وجود صرف حکومت الٰہیہ ہی میں ممکن ہے، اسلیے کہ وہاں کسی ادنیٰ سے ادنیٰ انسان کے خیالات، اعمال و افعال کسی فرد یا جماعت کے تابع نہیں ہوتے، بلکہ صرف حق تعالیٰ جل شانہٗ کے احکام و تعلیمات کے تابع ہوتے ہیں - اخلاق کے حسن و قبح کو تمدن کے فنا و بقا میں بہت بڑا دخل ہے - اسلامی حکومت کی بنیاد ہی اصلاح اخلاق پر قائم ہے - حکومت الٰہی نہ صرف یہ کہ اظہار گناہ سے مانع ہوتی ہے بلکہ اندھیری کوٹھڑی میں بھی برے اخلاق و افعال کے ارتکاب کو روکتی ہے - گناہوں کی روک تمام وہاں ظاہر ہی میں نہیں ہوتی بلکہ باطن میں بھی ہوتی ہے، اسلیے کہ خدا کی حکومت اُن اخلاقی بنیادوں کو منہدم کر دیتی ہے جن پر بدکرداریوں کی عمارت تعمیر ہوتی ہے -

اسلامی ریاست میں قانون سازی کے اختیارات انسان کو نہیں حاصل ہوتے، نہ کسی فرد کو نہ کسی جماعت کو، بلکہ سب کو قانونِ الٰہی کی پیروی کرنا پڑتی ہے - اسکا ایک بہت بڑا فائدہ

یہ ہوتا ہے کہ حکومت اور پبلک میں یک جہتی اور باہمی تعاون و ہمدردی کی روح پیدا ہو جاتی ہے جس سے ریاست دن دونی رات چوگنی ترقی کرتی ہے۔ علاوہ بریں قوانین کے اجراء و تنفیذ میں کوئی دشواری نہیں پیدا ہوتی اسلیے کہ سوسائیٹی کے افراد میں اطاعت کا داعیہ خود موجود ہوتا ہے اور قانون الہٰی کی اطاعت کی جانب اس عام رجحان کی وجہ سے جو فضا پیدا ہوتی ہے اس میں خود بخود مطیع اور پابندِ قانون اشخاص پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

قانون کے اجراء و تنفیذ کے اختیارات بے شک ہیئت انتظامیہ، یعنی حکومت ہی کے ہاتھ میں ہوتے ہیں، اور حکومت میں بھی ایک شخص، یعنی خلیفہ یا امیر کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے، لیکن سب سے بڑا بنیادی فرق جو اس حکومت کو دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں حکومت ایک متقی سوسائیٹی کے اندر بنتی ہے اور انتظامی کاموں کے لیے عاملین کا انتخاب اہلِ تقویٰ لوگوں میں سے کیا جاتا ہے۔ برعکس اسکے دوسری حکومتیں اُس سوسائیٹی میں بنتی ہیں جس میں تقویٰ کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ اس فرق کی وجہ سے انتظامی اختیارات ایک شخص یا چند اشخاص کے ہاتھ میں دینے کے جو نتائج غیر متقی سوسائیٹی میں ظاہر ہوتے ہیں وہ متقی سوسائیٹی میں ظاہر نہیں ہو سکتے۔ پھر یہ اختیارات جو عاملین حکومت کو دیے جاتے ہیں، یہ بھی غیر محدود نہیں ہیں۔ جن امور میں شرع کے احکام صریح ہیں ان میں حکومت کی حیثیت ایک آلۂ تنفیذ سے زیادہ نہیں ہے۔ اور جو امور ان کے ماسویٰ ہیں ان میں اول تو حکومت کو مشورے کا پابند کیا گیا ہے، دوسرے اسلامی شعور رکھنے والی پبلک کو محاسبہ اور تنقید کے پورے اختیارات دیے گئے ہیں۔ اسلام لوگوں میں یہ اسپرٹ پیدا کرتا ہے کہ وہ حکمرانوں کے اعمال کو غور سے دیکھتے رہیں۔ جب تک وہ خدا و رسول کی ہدایت پر چل رہے ہوں، اُنکی پوری اطاعت کریں، جب اُن کا

روِیہ مشکوک ہو تو محاسبہ کریں، تنقید اور نصیحت سے اصلاح کی کوشش کریں، اور جب انکو اتنا منحرف پائیں کہ دین میں فساد کا خطرہ ہو تو انہیں معزول کر دیں۔

خلافت الٰہیہ کا مقصد مندرجہ بالا سطور پڑھنے کے بعد قیام خلافت الٰہیہ کا مقصد خود بخود سمجھ میں آجاتا ہے۔ لیکن ہم اسکے ماخذ کے ساتھ اسکا تذکرہ کرتے ہیں تاکہ شک و ریب کی گنجائش نہ رہے۔ قرآن مجید مندرجہ ذیل الفاظ میں خلافت اسلامیہ کے مقاصد کا تذکرہ کرتا ہے :-

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ

(وہ لوگ ایسے ہیں) کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کرینگے اور زکوۃ دینگے اور اچھے کاموں کا حکم کرینگے اور برے کاموں سے روکینگے۔

اس آیت میں قیام خلافت کے چار مقاصد بیان کیے گئے ہیں، اقامتہ صلوٰۃ - ایتاء زکوٰۃ امر بالمعروف - نہی عن المنکر - اقامتہ صلوٰۃ سے مراد صرف نماز ہی پڑھنا نہیں ہے بلکہ کل عبادات بدنیہ اپنے اپنے درجات کے اعتبار سے اس میں داخل ہیں۔ اسی طرح ایتاء زکوٰۃ سے مراد محض زکوٰۃ دینا ہی نہیں ہے بلکہ پورے معاشی نظام کو اسلامی معیار و اصول پر قائم کر دینا بھی اس میں داخل ہے۔ رہے امر بالمعروف و نہی عن المنکر، تو پہلے ترقی کی حقیقت کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے اسے پیش نظر رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے کہ ہر معروف انسان کی حقیقی ترقی میں معاون اور ہر منکر اسکی ترقی میں مانع ہے۔ پس دوسرے الفاظ میں خلافت الٰہیہ کے قیام کے مقاصد یہ ہیں: عبد و معبود کے تعلق کو مضبوط و مستحکم بنانا اور بنی نوع انسان کو صحیح معنوں میں خداوند عالم کا بندہ بنانا دنیا کے معاشی نظام کو درست کر کے ایسی حالت پر قائم رکھنا جس میں نہ جماعتی قارونیت کا وجود ہو سکے نہ شخصی قارونیت کا، اور نہ فاقہ کشی و غربت کے دلگداز نظارے دیکھنے میں آئیں۔

نوعِ انسانی کو ہر شعبہ زندگی میں ارتقاء و عروج کی طرف بڑھانا اور اِس راہ میں جو موانع ہوں انکو دور کرنا۔

خلافت الٰہیہ کا مفہوم اور مقصد معلوم کرنیکے بعد غالباً مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کی وہ غلط فہمیاں رفع ہو جائینگی جو وہ تحریک اسلام اور اسلامی ریاست و حکومت کے متعلق رکھتے ہیں۔ غیر اسلامی ماحول میں عرصہ دراز سے پرورش پانے کی وجہ سے غیر مسلم تو غیر مسلم، خود مسلمان بھی اسلامی حکومت کے متعلق بہت زیادہ غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ عوام تو عوام خود علماء اسلام میں بھی ریاست کے اسلامی تصور اور اسکے اصول و مقاصد پر نظر رکھنے والے شاذ و نادر ہی ہونگے۔ مسلمانوں کے ذہن میں اسلامی حکومت کا جب تصور آتا ہے تو انکی آنکھوں کے سامنے زمانہ سابق کے مسلمان بادشاہوں کی مطلق العنان فرمانروائی، یا زمانۂ حال کے اتاترک اور عصمت اینونو کی جمہوریت کا نقشہ پھر جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کا مطلب یہ ہے کہ ہم حاکم مطلق ہونگے خوب دادِ عیش دینگے اور ہمارے ماتحت جو قومیں ہونگی انکے ساتھ جو چاہینگے سلوک کرینگے۔ حالانکہ اسلامی حکومت کا اگر یہ مفہوم ہو تو اس میں اور غیر اسلامی حکومت میں کوئی فرق نہیں۔ یہی غلط فہمی ہے جسکی بناء پر ہندوستان کا مسلمان یہ احمقانہ خیال رکھتا ہے کہ غیر اسلامی طریقے اختیار کرکے، شعائر اسلامی کو پامال کرکے، مغربی معاشرت و تمدن اختیار کرکے، عورتوں اور مردوں کی مخلوط تعلیم رائج کرکے، بے حیائی و بے غیرتی کی اشاعت کرکے، اور سر سے پیر تک غیر اسلامی بنکر بھی وہ اسلامی حکومت قائم کرسکتا ہے۔ رہے غیر مسلم تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی حکومت کے معنی مسلمان نامی ایک قوم کے دوسری قوموں پر حکمراں بن جانے کے ہیں۔ یہ ایک قوم پر دوسری قوم کی حکومت ویسے ہی ایک بدمزہ چیز ہے جس کا کوئی بھی برضا و رغبت خیر مقدم نہیں کرسکتا۔ مگر جب وہ اپنے ہمسایہ مسلمانوں کے اخلاق و اعمال کو دیکھتا ہے تو اس خیال سے اسکی روح کانپ

جاتی ہے کہ یہ مالک الملک اور ہم رعیت ہوں تو ہمارا حشر کیا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ جو اخلاق و اعمال ہندوؤں اور سکھوں اور دوسری قوموں میں نظر آتے ہیں انکو دیکھتے ہوئے کوئی غیر قوم ہندو یا سکھ حکومت کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتی۔ بالکل اسی طرح اسلامی حکومت کو مسلمانوں کی قومی حکومت، اور وہ بھی ان مسلمانوں کی حکومت سمجھنے کے بعد غیر مسلموں میں اس سے وحشت بلکہ نفرت ہونا کوئی خلافِ توقع امر نہیں ہے۔

ان غلط فہمیوں نے تحریک اسلام اور دعوتِ خلافت الٰہیہ کی راہ میں سخت رکاوٹ پیدا کردی ہے۔ گذشتہ سطور ان غلط فہمیوں کو دور کردینے کے لیے کافی ہیں۔ مگر یاددہانی کے طور پر میں پھر اس بات کا اعادہ کرتا ہوں اور مسلمان اور غیر مسلم دونوں کو اچھی طرح اس سے واقف ہو جانا چاہیے کہ اسلامی حکومت کے معنی مسلمانوں کی حاکمیت (Sovereignty) کے نہیں ہیں۔ مسلمانوں کی حاکمیت اسی طرح اور اسی قدر ناجائز اور خلافِ حق و انصاف ہے جس قدر غیر مسلموں کی حاکمیت۔ اسلام سرے سے انسانی حاکمیت ہی کا مخالف ہے۔ اس کا مدعا تو اللہ کی حاکمیت قائم کرنا ہے اور اس اصل الاصول کے خلاف جہاں جو حکومت بھی ہو وہ اسکو غلط کہتا ہے خواہ وہ کسی مسلمان بادشاہ یا رئیس کی حکومت ہو یا غیر مسلم راجہ اور قیصر کی، اور خواہ وہ کسی مسلمان قوم کی حکومت ہو یا غیر مسلم قوم کی۔ درحقیقت اسلامی حکومت نام ہے ان اصول و قوانین کی حکومت کا جو حق تعالیٰ نے بنی نوع انسان کی فلاح و ترقی کے لیے اپنی کتاب اور اپنے رسول کے ذریعے سے انسان کو تعلیم کیے ہیں۔ اور اسلامی حکومت کی جانب دعوت دینے کا مطلب انہی اصول و قوانین کی جانب دعوت دینا ہوتا ہے نہ کہ مسلمانوں کی غلامی اور ماتحتی کی جانب۔ ہم غیر مسلموں کو اپنے ماتحت لانا نہیں چاہتے نہ ہم اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں بلکہ ہم تو چند اصول و قوانین کی تبلیغ کرتے ہیں اور انکے مطابق اپنی اور

دوسروں کی زندگی کو ڈھالنا چاہتے ہیں۔ وہ اصول اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے ہیں اسلیے دوسرے الفاظ میں ہم دنیا کے ہر انسان کو دوسرے انسانوں کی اور خود اسکے اپنے نفس کی غلامی سے آزادی دلاکر اللہ تعالیٰ کی حکومت میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت ہم میں اور غیر مسلموں میں جو فرق نظر آتا ہے وہ اسلیے ہے کہ ہم داعی ہیں اور وہ مدعو۔ لیکن جب وہ ان اصولوں کو قبول کرکے ان پر عمل پیرا ہو جائینگے تو ہم اور وہ مساوی ہو جائینگے، بلکہ ممکن ہے کہ انفرادی حیثیت سے موجودہ دور کے نسلی مسلمان سے وہ اشخاص اور جماعتیں ترقی و عروج میں بازی لیجائیں جو اسلام کے اصول و قوانین کو بعد میں قبول کریں۔ ان اصول و قوانین کے منافع کسی نسل و وطن، قوم و قبیلہ کے ساتھ مقید و محدود نہیں ہیں۔ دنیا کی ہر قوم و ہر نسل کے اشخاص اس سے یکساں طور پر منتفع ہو سکتے ہیں۔ جس طرح ان سے عبداللہ و عبدالرحمٰن ترقی و فلاح حاصل کر سکتے ہیں اسی طرح ان پر عمل کرکے گاندھی و جواہر لال بھی فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔

پھر ہماری یہ دعوت کسی تعصب، کسی عناد، کسی مجادلہ و مقابلہ کے لیے نہیں ہے بلکہ محض بنی نوع انسان کی فلاح اور بلندی و ترقی کے لیے ہے۔ دشمنی کے بجائے انکی ہمدردی و خیرخواہی کا جذبہ اس دعوت کا محرک ہے۔ اور اسکی بنیاد محض جذبات پر قائم نہیں ہے بلکہ قوی و مستحکم عقلی و نظری دلائل پر قائم ہے جو ہر صحیح الفطرت اور سلیم العقل انسان کو اپیل کر سکتے ہیں۔

قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں

الٰہ، رب، دین اور عبادت، یہ چار لفظ قرآن کی اصطلاحی زبان میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ قرآن کی ساری دعوت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اکیلا رب اور الٰہ ہے، اسکے سوا نہ کوئی الٰہ ہے نہ رب، اور نہ الوہیت و ربوبیت میں کوئی اس کا شریک ہے۔ لہٰذا اُسی کو اپنا الٰہ اور رب تسلیم کرو اور اسکے سوا ہر ایک کی الٰہیت و ربوبیت سے انکار کر دو، اسکی عبادت اختیار کرو اور اسکے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اسکے لیے اپنے دین کو خالص کر لو اور ہر دوسرے دین کو رد کر دو۔

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْٓ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء - ۲)

ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھی بھیجا ہے اس کی طرف یہی وحی کی ہے کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے لہٰذا میری عبادت کرو۔

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (التوبہ - ۵)

اور انکو کوئی حکم نہیں دیا گیا بجز اسکے کہ ایک ہی الٰہ کی عبادت کریں۔ اُس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور وہ پاک ہے اُس شرک سے جو وہ کرتے ہیں۔

اِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء - ۶)

یقیناً تمہارا (یعنی تمام انبیاء کا) یہ گروہ ایک ہی گروہ ہے اور میں تمہارا رب ہوں لہٰذا میری عبادت کرو۔

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ (انعام - ۲۰)

کہو، کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں حالانکہ وہی ہر چیز کا رب ہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (الکہف - ۱۲)

تو جو کوئی اپنے رب کی ملاقات کا امیدوار ہو اسے چاہیے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی اور کی عبادت شریک نہ کرے۔

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ (النحل - ۵)

ہم نے ہر قوم میں ایک رسول اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی عبادت سے پرہیز کرو۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (آل عمران - ۹)

تو کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں حالانکہ جتنی چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں سب چار و ناچار اسی کی مطیع ہیں اور اسی کی طرف انہیں پلٹ کر جانا ہے۔

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ (الزمر - ۲)

اے نبی کہو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت کروں اپنے دین کو اسکے لیے خالص کرتے ہوئے۔

اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (آل عمران - ۵)

اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تم سب کا رب بھی، لہٰذا اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔

یہ چند آیات محض نمونہ کے طور پر ہیں، ورنہ جو شخص قرآن کو پڑھے گا وہ اول نظر میں محسوس کر لیگا کہ قرآن کا سارا بیان انہی چار اصطلاحوں کے گرد گھوم رہا ہے۔ اس کتاب کا مرکزی خیال (Central Idea) یہی ہے کہ اللہ رب اور الٰہ ہے اور ربوبیت و الٰہیت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہے، لہٰذا عبادت اسی کی ہونی چاہیے اور دین خالصۃً اسی کے لیے ہونا چاہیے۔

اصطلاحات اربعہ کی اہمیت اب یہ ظاہر بات ہے کہ قرآن کی تعلیم کو سمجھنے کے لیے ان چاروں اصطلاحوں کا صحیح اور مکمل مفہوم سمجھنا بالکل ناگزیر ہے۔ اگر کوئی شخص نہ جانتا ہو کہ الٰہ اور رب کا مطلب کیا ہے، عبادت کی کیا تعریف ہے، اور دین کسے کہتے ہیں، تو دراصل اسکے لیے

پورا قرآن بے معنی ہو جائیگا، وہ توحید کو جان سکیگا، نہ شرک کو سمجھ سکیگا، نہ عبادت کو اللہ کیلیے مخصوص کر سکیگا، اور نہ دین ہی کو اللہ کے لیے خالص کر سکیگا۔ اسی طرح اگر کسی کے ذہن میں ان اصطلاحوں کا مفہوم غیر واضح اور ناکمل ہو تو اسکے لیے قرآن کی پوری تعلیم غیر واضح ہوگی اور قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود اسکا عقیدہ اور عمل دونوں ناکمل رہ جائینگے۔ وہ لا الٰہ الا اللہ کہتا رہیگا اور اسکے باوجود بہتوں کو الٰہ بناتا رہیگا۔ وہ اللہ کے سوا کسی کے رب ہونے کا اعلان کرتا رہیگا اور اسکے باوجود بہت سے ارباب من دون اللہ اس کے رب بنے رہینگے۔ وہ پوری نیک نیتی کے ساتھ کہے گا کہ میں اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتا، اور پھر بھی بہت سے معبودوں کی عبادت میں مشغول رہیگا۔ وہ پورے زور کے ساتھ کہیگا کہ میں اللہ کے دین میں ہوں، اور اگر کسی دوسرے دین کی طرف اسے منسوب کیا جائے تو لڑنے پر آمادہ ہو جائیگا، مگر اسکے باوجود بہت سے دینوں کا قلادہ اسکی گردن میں پڑا رہیگا۔ اسکی زبان سے کسی غیر اللہ کے لیے "الٰہ" اور "رب" کے الفاظ تو کبھی نہ نکلینگے، مگر یہ الفاظ جن معانی کے لیے وضع کیے گئے ہیں اُنکے لحاظ سے اسکے بہت سے الٰہ اور ارباب ہونگے اور اس بے چارے کو خبر تک نہ ہوگی کہ میں نے واقعی اللہ کے سوا دوسرے ارباب و الٰہ بنا رکھے ہیں۔ اسکے سامنے اگر آپ کہدیں کہ تو دوسروں کی "عبادت" کر رہا ہے اور "دین" میں شرک کا مرتکب ہو رہا ہے تو وہ پتھر مارنے اور منہ نوچنے کے لیے دوڑیگا مگر عبادت اور دین کی جو حقیقت ہے اسکے لحاظ سے واقعی وہ دوسروں کا عابد اور دوسروں کے دین میں داخل ہوگا اور نہ جانے گا کہ یہ جو کچھ میں کر رہا ہوں یہ حقیقت میں دوسروں کی عبادت ہے، اور یہ حالت جس میں مبتلا ہوں یہ حقیقت میں غیر اللہ کا دین ہے۔

غلط فہمی کا اصل سبب | عرب میں جب قرآن پیش کیا گیا تھا اُس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ الٰہ کے کیا معنی ہیں اور رب کسے کہتے ہیں، کیونکہ یہ دونوں لفظ انکی بول چال میں پہلے سے مستعمل تھے،

انہیں معلوم تھا کہ ان الفاظ کا اطلاق کس مفہوم پر ہوتا ہے۔ اسیلیے جب ان سے کہا گیا کہ اللہ ہی اکیلا الٰہ اور رب ہے اور الوہیت و ربوبیت میں کسی کا قطعاً کوئی حصہ نہیں، تو وہ پوری بات کو پا گئے۔ انہیں بلا کسی التباس و اشتباہ کے معلوم ہو گیا کہ دوسروں کے لیے کس چیز کی نفی کی جا رہی ہے اور اللہ کے لیے کس چیز کو خاص کیا جا رہا ہے۔ جنہوں نے مخالفت کی یہ جان کر کی کہ غیر اللہ کی الوہیت و ربوبیت کے انکار سے کہاں کہاں ضرب پڑتی ہے، اور جو ایمان لائے وہ یہ سمجھ کر ایمان لائے کہ اس عقیدہ کو قبول کر کے ہمیں کیا چھوڑنا اور کیا اختیار کرنا ہوگا۔ اسی طرح عبادت اور دین کے الفاظ بھی ان کی بولی میں پہلے سے رائج تھے، انکو معلوم تھا کہ عبد کسے کہتے ہیں، عبودیت کس حالت کا نام ہے، عبادت سے کونسا رویہ مراد ہے، اور دین کا کیا مفہوم ہے، اسیلیے جب ان سے کہا گیا کہ سب کی عبادت چھوڑ کر صرف اللہ کی عبادت کرو، اور ہر دین سے الگ ہو کر اللہ کے دین میں داخل ہو، تو انہیں قرآن کی دعوت کو سمجھنے میں کوئی غلط فہمی پیش نہ آئی۔ وہ سنتے ہی سمجھ گئے کہ یہ تعلیم ہماری زندگی کے نظام میں کس نوعیت کے تغیر کی طالب ہے۔

لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصلی معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے، بدلتے چلے گئے، یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لیے خاص ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ تو خالص عربیت کے ذوق کی کمی تھی، اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے اُن کے لیے الٰہ اور رب اور دین اور عبادت کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے جو نزول قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے۔ انہی دونوں وجوہ سے دورِ اخیر کی کتب لغت و تفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح اصل معانی لغوی کے بجائے ان معانی سے کی جانے لگی جو بعد کے

مسلمان سمجھنے لگے۔ مثلاً لفظ الٰہ کو قریب قریب بتوں اور دیوتاؤں کا ہم معنی بنا دیا گیا، رب کو پالنے پوسنے والے یا پروردگار کا مترادف ٹھیرا دیا گیا، عبادت کے معنی پوجا اور پرستش کے کیے گئے، دین کو دھرم اور مذہب اور (Religion) کے مقابلہ کا لفظ قرار دیا گیا، طاغوت کا ترجمہ بُت یا شیطان کیا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کا اصل مدعا ہی سمجھنا لوگوں کے لیے مشکل ہو گیا۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو الٰہ نہ بناؤ، لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بتوں اور دیوتاؤں کو چھوڑ دیا ہے لہٰذا قرآن کا منشا پورا کر دیا، حالانکہ الٰہ کا مفہوم اور جن چیزوں پر عائد ہوتا ہے ان سب کو وہ اچھی طرح پکڑے ہوئے ہیں اور انہیں خبر نہیں کہ یہ ہم غیر اللہ کو الٰہ بنا رہے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو رب تسلیم نہ کرو، لوگ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ کے سوا کسی کو پروردگار نہیں مانتے لہٰذا ہماری توحید مکمل ہو گئی، حالانکہ رب کا اطلاق اور جن مفہومات پر ہوتا ہے ان کے لحاظ سے اکثر لوگوں نے خدا کے بجائے دوسروں کی ربوبیت قبول کر رکھی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ طاغوت کی عبادت چھوڑ دو اور صرف اللہ کی عبادت کرو، لوگ کہتے ہیں کہ ہم بتوں کو نہیں پوجتے، شیطان پر لعنت بھیجتے ہیں، اور صرف اللہ کو سجدہ کرتے ہیں، لہٰذا ہم نے قرآن کی یہ بات بھی پوری کر دی، حالانکہ پتھر کے بتوں کے سوا دوسرے طاغوتوں سے وہ چمٹے ہوئے ہیں اور پرستش کے سوا دوسری قسم کی تمام عبادتیں انہوں نے اللہ کے بجائے غیر اللہ کے لیے خاص کر رکھی ہیں۔ یہی حال دین کا ہے کہ اللہ کے لیے دین کو خالص کرنے کا مطلب صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ آدمی ”مذہب اسلام“ قبول کر لے اور ہندو یا عیسائی یا یہودی نہ رہے، اس بنا پر ہر وہ شخص جو ”مذہب اسلام“ میں ہے یہ سمجھ رہا ہے کہ میں نے اللہ کے لیے دین کو خالص کر رکھا ہے، حالانکہ دین کے وسیع تر مفہوم کے لحاظ سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کا دین اللہ کے لیے خالص نہیں ہے۔

غلط فہمی کے نتائج | پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم، بلکہ اسکی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی ہے اور اسلام قبول کرنے کے باوجود لوگوں کے عقائد و اعمال میں جو نقائص نظر آ رہے ہیں ان کا ایک بڑا سبب یہی ہے۔ لہٰذا قرآن مجید کی مرکزی تعلیم اور اسکے حقیقی مدعا کو واضح کرنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ان اصطلاحوں کی پوری پوری تشریح کی جائے۔

اگرچہ میں اس سے پہلے اپنے متعدد مضامین میں ان کے مفہوم پر روشنی ڈالنے کی کوشش کر چکا ہوں، لیکن جو کچھ اب تک میں نے بیان کیا ہے وہ نہ تو بجائے خود تمام غلط فہمیوں کو صاف کرنے کے لیے کافی ہے، اور نہ اس سے لوگوں کو پوری طرح اطمینان حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ لغت اور آیات قرآنی سے استشہاد کے بغیر لوگ میری ہر تشریح کو میری ذاتی رائے سمجھتے ہیں، اور میری رائے کم از کم ان لوگوں کے لیے تو اطمینان کی موجب نہیں ہو سکتی جو مجھ سے اختلاف رائے رکھتے ہوں۔ اس مضمون میں میں کوشش کرونگا کہ ان چاروں اصطلاحوں کا مکمل مفہوم واضح کروں، اور کوئی ایسی بات بیان نہ کروں جس کا ثبوت لغت اور قرآن سے نہ ملتا ہو۔

ترتیب کے لحاظ سے ہم سب سے پہلے لفظ الٰہ کو لینگے۔ پھر رب، پھر عبادت، پھر دین،

الٰہ

لغوی تحقیق | اس لفظ کا مادّہ ا ل ہ ہے اس مادّہ سے جو الفاظ لغت میں آئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

اَلِہَ اذا تحیّر، یعنی حیران و سرگشتہ ہوا۔

الہت الیٰ فلانٍ ای سکنت الیہ، یعنی اس کی پناہ میں جا کر یا اس سے تعلق پیدا کر کے میں نے سکون و اطمینان حاصل کیا۔

الہ الرجل یالہ اذا فزع من امر نزل بہ فآلہہ غیرہ ای اجارہ - یعنی آدمی کسی مصیبت یا تکلیف کے نزول سے خوف زدہ ہوا اور دوسرے نے اسکو پناہ دی۔

الہ الرجل الی الرجل اتجہ الیہ لشدۃ شوقہ الیہ - آدمی نے دوسرے کی طرف شدت شوق کی وجہ سے توجہ کی۔

الہ الفصیل اذا ولع بامہ - اونٹنی کا بچہ جو اس سے بچھڑ گیا تھا ماں کو پاتے ہی اس سے چمٹ گیا۔

لاہ یلیہ لیہا ولاہا اذا احتجب - یعنی پوشیدہ و مستور ہوا - نیز ارتفع یعنی بلند ہوا۔

الہ الٰہۃً و اُلوھۃً و الوھیۃً عبد - یعنی عبادت کی۔

ان تمام معانی مصدر یہ پر غور کرنے سے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اَلَہَ یالَہُ اِلٰھۃً کے معنی عبادت (پرستش) اور الٰہ کے معنی معبود کس مناسبت سے پیدا ہوئے:

انسان کے ذہن میں عبادت کیلئے اولین تحریک اپنی حاجتمندی سے پیدا ہوتی ہے۔ وہ کسی کی عبادت کا خیال تک نہیں کر سکتا جب تک اسے یہ گمان نہ ہو کہ وہ میری حاجتیں پوری کر سکتا ہے خطرات اور مصائب میں مجھے پناہ دے سکتا ہے اضطراب کی حالت میں مجھے سکون بخش سکتا ہے۔

پھر یہ بات کہ آدمی کسی کو حاجت روا سمجھے اس تصور کے ساتھ لازم و ملزوم کا تعلق رکھتی ہے کہ وہ اسے اپنے سے بالاتر سمجھے اور نہ صرف مرتبہ کے اعتبار سے اسکی برتری تسلیم کرے بلکہ طاقت اور زور کے اعتبار سے بھی اسکی بالادستی کا قائل ہو۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سلسلۂ اسباب و علل کے تحت جن چیزوں سے بالعموم انسان کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور جنکی حاجت روائی کا سارا عمل انسان کی آنکھوں کے سامنے یا اسکے حدود علم کے اندر واقع ہوتا ہے انکے متعلق پرستش کا کوئی جذبہ اس میں پیدا نہیں ہوتا مثلاً مجھے خرچ کیلئے روپے کی ضرورت ہوتی ہے، میں جا کر ایک شخص سے نوکری یا مزدوری کی درخواست کرتا ہوں، وہ میری درخواست کو قبول کر کے مجھے کوئی کام دیتا ہے اور اس کام کا معاوضہ مجھے دے دیتا ہے۔ یہ سارا عمل چونکہ میرے حواس اور علم کے دائرے کے اندر پیش آیا ہے اور میں جانتا ہوں کہ اس نے میری یہ حاجت کس طرح پوری کی ہے، اسلیے میرے ذہن میں اسکے لائق پرستش ہونے کا وہم تک نہیں گذرتا۔ پرستش کا تصور میرے ذہن میں صرف

اسی حالت میں پیدا ہو سکتا ہے جبکہ کسی کی شخصیت یا اسکی طاقت یا اسکی حاجت روائی و اثر اندازی کی کیفیت پر راز کا پردہ پڑا ہوا ہو۔ اسی لیے معبود کے معنی میں وہ لفظ اختیار کیا گیا جسکے اندر رفعت کے ساتھ پوشیدگی اور حیرانی و سرگشتگی کا مفہوم بھی شامل ہے۔

پھر جسکے متعلق بھی انسان یہ گمان رکھتا ہو کہ وہ احتیاج کی حالت میں حاجت روائی کر سکتا ہے، خطرات میں پناہ دے سکتا ہے، اضطراب میں سکون بخش سکتا ہے، اسکی طرف انسان کا اشتیاق کے ساتھ توجہ کرنا ایک امر ناگزیر ہے۔

پس معلوم ہوا کہ معبود کیلیے الٰہ کا لفظ جن تصورات کی بنا پر بولا گیا وہ یہ ہیں: حاجت روائی۔ پناہ دہندگی۔ سکون بخشی۔ بالاتری و بالادستی۔ ان اختیارات اور ان طاقتوں کا مالک ہونا جن کی وجہ سے یہ توقع کی جائے کہ معبود قاضی الحاجات اور پناہ دہندہ ہو سکتا ہے۔ اسکی شخصیت کا پراسرار ہونا یا منظرِ عام پر نہ ہونا۔ انسان کا اسکی طرف مشتاق ہونا۔

اہلِ جاہلیت کا تصورِ الٰہ اس لغوی تحقیق کے بعد ہمیں دیکھنا چاہیے کہ الوہیت کے متعلق اہلِ عرب اور امم قدیمہ کے وہ کیا تصورات تھے جنکی تردید قرآن کرنا چاہتا ہے:

(۱) وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لِّيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا (مریم - ۵)

اور انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے الٰہ بنا رکھے ہیں تاکہ وہ ان کے لیے ذریعۂ قوت ہوں (یا انکی حمایت میں آکر وہ محفوظ رہیں)

وَاتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ آلِهَةً لَّعَلَّهُمْ يُنصَرُونَ (یٰس - ۵)

اور انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے الٰہ بنا لیے ہیں اس امید پر کہ انکی مدد کی جائیگی (یعنی وہ الٰہ انکی مدد کرینگے)

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ جاہلیت جنکو الٰہ کہتے تھے انکے متعلق وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ انکے پشتیبان ہیں مشکلات اور مصائب میں انکی حفاظت کرتے ہیں، اور انکی حمایت میں وہ خوف اور نقصان سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

(۲) فَمَا أَغْنَتْ عَنْهُمْ آلِهَتُهُمُ الَّتِي يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مِن شَيْءٍ لَّمَّا جَاءَ أَمْرُ رَبِّكَ وَمَا زَادُوهُمْ غَيْرَ تَتْبِيبٍ (ہود - ۹)

پھر جب تیرے رب کے فیصلہ کا وقت آگیا تو انکے وہ الٰہ جنہیں وہ اللہ کے بجائے پکارا کرتے تھے، انکے کچھ بھی کام نہ آسکے اور وہ انکے لیے تباہی و ہلاکت کے سوا کسی اور چیز میں اضافہ کا سبب نہ بنے۔

وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ أَمْوَاتٌ

اور اللہ کے بجائے جنکو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ کسی چیز کے بھی خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں، مردہ

غَيْرُ اَحْيَاۗءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ؕ	ہیں نہ کہ زندہ، اور انہیں یہ بھی خبر نہیں ہے کہ انہیں کب
اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ (النحل -۳)	دوبارہ زندہ کرکے اٹھایا جائیگا۔ تمہارا الٰہ تو ایک ہی الٰہ ہے۔
لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰـهًا اٰخَرَ ۘ	اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو نہ پکار، اس کے
لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (قصص -۹)	سوا کوئی الٰہ نہیں۔
وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ	جو لوگ اللہ کے بجائے دوسرے شریکوں کو پکارتے
دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَاۗءَ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا	ہیں وہ محض وہم پر چلتے ہیں اور نری اٹکلیں
الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ (یونس -۷)	دوڑاتے ہیں۔

ان آیات سے چند امور پر روشنی پڑتی ہے۔ ایک یہ کہ اہلِ جاہلیت جنکو الٰہ کہتے تھے انہیں مشکل کشائی و حاجت روائی کے لیے پکارتے یا بالفاظِ دیگر ان سے دعا مانگتے تھے دوسرے یہ کہ انکے یہ الٰہ صرف جن یا فرشتے یا دیوتا ہی نہ تھے بلکہ وفات یافتہ انسان بھی تھے، جیسا کہ امواتٌ غیرُ احیاءٍ وما یشعرون ایان یبعثون سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ ان الٰہوں کے متعلق وہ یہ گمان رکھتے تھے کہ وہ انکی دعاؤں کو سنتے ہیں اور انکی مدد کو پہنچنے پر قادر ہیں۔

یہاں دعا کے مفہوم اور اُس امداد کی نوعیت کو ذہن نشین کرلینا ضروری ہے جسکی الٰہ سے توقع کی جاتی ہے۔ اگر مجھے پیاس لگتی ہے اور میں اپنے خادم کو پانی لانے کے لیے پکارتا ہوں یا اگر میں بیمار ہوتا ہوں اور علاج کے لیے ڈاکٹر کو بلاتا ہوں تو اس پر نہ دعا کا اطلاق ہوتا ہے اور نہ اسکے معنی خادم یا ڈاکٹر کو الٰہ بنانے کے ہیں۔ کیونکہ یہ سب کچھ سلسلۂ اسباب کے تحت ہے نہ کہ اس سے مافوق۔ لیکن اگر میں پیاس کی حالت میں یا بیماری میں خادم یا ڈاکٹر کو پکارنے کے بجائے کسی ولی یا کسی دیوتا کو پکارتا ہوں تو یہ ضرور اسکو الٰہ بنانا اور اس سے دعا مانگنا ہے، کیونکہ جو ولی صاحب

مجھ سے سینکڑوں میل دور کسی قبر میں آرام فرما رہے ہیں، انکو پکارنے کے معنی یہ ہیں کہ میں ان کو سمیع و بصیر سمجھتا ہوں اور یہ خیال رکھتا ہوں کہ عالم اسباب پر انکی فرمانروائی قائم ہے جسکی وجہ سے وہ مجھ تک پانی پہنچانے یا میری بیماری دور کر دینے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس ایسی حالت میں کسی دیوتا کو پکارنے کے معنی یہ ہیں کہ پانی یا صحت و مرض پر اسکی حکومت ہے اور وہ فوق الطبیعی طور پر میری حاجت پوری کرنے کے لیے اسباب کو حرکت دے سکتا ہے۔ پس الٰہ کا وہ تصور جسکی بنا پر اس سے دعا مانگی جاتی ہے لامحالہ ایک فوق الطبیعی اقتدار اور اس کے ساتھ ہی فوق الطبیعی قوتوں کے مالک ہونے کا تصور ہے۔

(۳) وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ، فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً، بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (احقاف - ۴)

تمہارے اردگرد جن بستیوں کے آثار ہیں انکو ہم ہلاک کر چکے ہیں۔ انہیں ہم نے بار بار بدل بدل کر اپنی نشانیاں دکھائی تھیں تاکہ وہ رجوع کریں۔ تو جنکو انہوں نے تقرب کا ذریعہ سمجھ کر اللہ کے سوا اپنا الٰہ بنایا تھا انہوں نے نزولِ عذاب کے وقت کیوں نہ انکی مدد کی؟ مدد تو درکنار وہ تو انہیں چھوڑ کر غائب ہو گئے۔ یہ تھی حقیقت ان کے جھوٹ اور ان کی من گھڑت باتوں کی۔

وَمَا لِيَ لَا اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖ اٰلِهَةً اِنْ يُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا وَّلَا يُنْقِذُوْنِ (۳۶ - ۲)

کیوں نہ میں اس کی عبادت کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف تم سب کو پلٹنا ہے؟ کیا اس کے سوا میں ان کو الٰہ بناؤں جن کا حال یہ ہے کہ اگر رحمٰن مجھے کوئی نقصان پہنچانا چاہے تو انکی سفارش میرے کچھ کام نہیں آسکتی اور وہ مجھے چھڑا نہیں سکتے؟

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ أَوْلِیَاءَ، مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَا إِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى، إِنَّ اللّٰهَ یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ فِیْ مَا هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ (الزمر - ۱)

اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا دوسرے حامی یا کارساز ٹھیرا رکھے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تو انکی عبادت اس لیے کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ سے قریب کردیں، اللہ ان کے درمیان اُس معاملہ کا فیصلہ (قیامت کے روز) کریگا جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔

وَیَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهُمْ وَلَا یَنْفَعُهُمْ وَیَقُوْلُوْنَ هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس - ۲)

وہ اللہ کے سوا انکی عبادت کرتے ہیں جو نہ انکو ضرر پہنچانے پر قادر ہیں نہ نفع، اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔

ان آیات سے چند مزید باتوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل جاہلیت اپنے الٰہوں کے متعلق یہ نہیں سمجھتے تھے کہ ساری خدائی انہی کے درمیان تقسیم ہوگئی ہے اور انکے اوپر کوئی خداوند اعلیٰ نہیں ہے۔ وہ واضح طور پر ایک خداوند اعلیٰ کا تصور رکھتے تھے جس کے لیے ان کی زبان میں اللہ کا لفظ تھا، اور دوسرے الٰہوں کے متعلق ان کا عقیدہ یہ تھا کہ اس خداوند اعلیٰ کی خدائی میں ان الٰہوں کا کچھ دخل اور اثر ہے، انکی بات مانی جاتی ہے، ان کے ذریعہ سے ہمارے کام بن سکتے ہیں، انکی سفارش سے ہم نفع حاصل کرسکتے ہیں اور نقصانات سے بچ سکتے ہیں۔ انہی خیالات کی بنا پر وہ اللہ کے ساتھ اُن کو بھی الٰہ قرار دیتے تھے لہٰذا اُنکی اصطلاح کے لحاظ سے جسکے متعلق بھی یہ خیالات رکھے جائیں وہ الٰہ ہے، یا بالفاظِ دیگر کسی کے متعلق یہ خیالات رکھنا اُسے الٰہ بنانا ہے۔

(۴) وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْا إِلٰهَیْنِ اثْنَیْنِ إِنَّمَا هُوَ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَإِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ (النحل - ۷)

اللہ فرماتا ہے کہ دو الٰہ نہ بناؤ، الٰہ تو ایک ہی ہے۔ لہٰذا تم مجھی سے ڈرو،

اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کی ناراضی سے خوف کیا جائے اور جس کے متعلق یہ گمان کیا جائے کہ اگر ہم اسکی توجہ اور عنایت سے محروم ہو گئے تو نقصان اٹھائینگے، وہ الٰہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں الٰہ کے تصور میں اسکے لائق خوف و حذر ہونے کا تصور بھی شامل ہے۔

(۵) اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (التوبہ-۵)

انہوں نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنالیا اور مسیح ابن مریم کو بھی رب ٹھہرایا حالانکہ انہیں صرف ایک الٰہ کی عبادت کا حکم دیا گیا تھا جس کے سوا کوئی اور الٰہ نہیں ہے۔

اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا (الفرقان-۴)

تیرا کیا خیال ہے اس شخص کے متعلق جس نے اپنی خواہش نفس کو الٰہ بنالیا ہے؟ کیا تو اسکی ذمہداری لے سکتا ہے؟

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ (الانعام-۱۶)

اس طرح بہت سے مشرکوں کے لیے انکے ٹھہرائے ہوئے شریکوں (یعنی شرکاء فی الالوہیت) نے اپنی اولاد کو قتل کرنے کا فعل خوشنما بنادیا۔

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ (الشوریٰ-۳)

یا وہ ایسے شرکاء (یعنی شرکاء فی الالوہیت) رکھتے ہیں جنہوں نے ان کے لیے از قسم دین ایسی شریعت مقرر کی ہے جس کی اجازت اللہ نے نہیں دی؟

ان آیات میں الٰہ کا ایک اور مفہوم ملتا ہے جو پہلے مفہومات سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں فوق الطبیعی اقتدار کا کوئی تصور نہیں ہے۔ جسکو الٰہ بنایا گیا ہے وہ یا تو کوئی انسان ہے یا انسان کا اپنا نفس ہے۔ اور الٰہ اسکو اس معنی میں نہیں بنایا گیا ہے کہ اس سے دعا مانگی جاتی ہو یا اسے نفع و نقصان کا مالک سمجھا جاتا ہو اور اسکی پناہ ڈھونڈی جاتی ہو، بلکہ وہ الٰہ اس معنی میں بنایا گیا ہے کہ اس کے حکم کو قانون تسلیم کیا گیا، اسکے امر و نہی کی اطاعت کی گئی، اسکے حلال کو حلال اور اسکے حرام کو

حرام مان لیا گیا، اور یہ خیال کر لیا گیا کہ اس کو بجائے خود حکم دینے اور منع کرنے کا اختیار حاصل ہے کوئی اور اقتدار اس سے بالاتر نہیں ہے جس کی سند لینے اور جس سے رجوع کرنے کی ضرورت ہو۔ پہلی آیت میں علماء اور راھبوں کو الٰہ بنانے کا ذکر ہے۔ اس کی واضح تشریح ہم کو حدیث میں ملتی ہے۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے جب اس آیت کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ جس چیز کو تمہارے علماء اور راھبوں نے حلال کیا اسے تم لوگ حلال مان لیتے تھے اور جسے انہوں نے حرام قرار دیا اسے تم حرام تسلیم کر لیتے تھے اور اس بات کی کچھ پروا نہ کرتے تھے کہ اللہ کا اس بارے میں کیا حکم ہے۔ رہی دوسری آیت تو اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ جو شخص اپنی خواہش نفس کی اطاعت کرتا ہو اور اسی کے حکم کو بالاتر رکھتا ہو وہ دراصل اپنے نفس ہی کو اپنا الٰہ بنائے ہوئے ہے۔ اسکے بعد والی دونوں آیتوں میں اگرچہ الٰہ کے بجائے شریک کا لفظ آیا ہے، مگر جیسا کہ ہم نے ترجمہ میں واضح کیا ہے شریک سے مراد الٰہیت میں شریک ٹھیرانا ہے، اور یہ دونوں آیتیں صاف فیصلہ کرتی ہیں کہ جو لوگ اللہ کے حکم کی سند کے بغیر کسی کے مقرر کیے ہوئے رواج یا ضابطہ یا طریقہ کو جائز قانون سمجھتے ہیں وہ اُس قانون ساز کو الٰہیت میں خدا کا شریک ٹھیراتے ہیں۔

الوہیت کے باب میں ملاکِ امر الٰہ کے یہ جتنے مفہومات اوپر بیان ہوئے ہیں ان سب کے درمیان ایک منطقی ربط ہے۔ جو شخص فوق الطبیعی معنی میں کسی کو اپنا حامی و مددگار، مشکل کشا اور حاجت روا، دعاؤں کا سننے والا اور نفع یا نقصان پہنچانے والا سمجھتا ہے، اسکے ایسا سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ اسکے نزدیک وہ ہستی نظام کائنات میں کسی نہ کسی نوعیت کا اقتدار رکھتی ہے۔ اسی طرح جو شخص کسی سے تقویٰ اور خوف کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اسکی ناراضی میرے لیے نقصان کی اور رضامندی میرے لیے فائدے کی موجب ہے اُسکے اس اعتقاد اور اس عمل کی وجہ بھی

اسکے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے ذہن میں اس ہستی کے متعلق ایک طرح کے اقتدار کا تصور رکھتا ہے پھر جو شخص خداوند اعلیٰ کو ماننے کے باوجود اسکے سوا دوسروں کی طرف اپنی حاجات کے لیے رجوع کرتا ہے اسکے اس فعل کی علت بھی صرف یہی ہے کہ خداوندی کے اقتدار میں وہ انکو کسی نہ کسی طرح کا حصہ دار سمجھ رہا ہے۔ اور علیٰ ہذا القیاس وہ شخص جو کسی کے حکم کو قانون اور کسی کے امر و نہی کو اپنے لیے واجب الاطاعت قرار دیتا ہے وہ بھی اس کو مقتدر اعلیٰ تسلیم کرتا ہے۔ پس الوہیت کی اصل روح اقتدار ہے، خواہ وہ اقتدار اس معنی میں سمجھا جائے کہ نظام کائنات پر اس کی فرمانروائی فوق الطبیعی نوعیت کی ہے، یا وہ اس معنی میں تسلیم کیا جائے کہ دنیوی زندگی میں انسان اسکے تحت امر ہے اور اس کا حکم بذاتِ خود واجب الاطاعت ہے۔

قرآن کا استدلال یہی اقتدار کا تصور ہے جسکی بنیاد پر قرآن اپنا سارا زور غیر اللہ کی الٰہیت کے انکار اور صرف اللہ کی الٰہیت کے اثبات پر صرف کرتا ہے۔ اس کا استدلال یہ ہے کہ زمین اور آسمان میں صرف ایک ہی ہستی تمام اختیارات و اقتدارات کی مالک ہے، خلق اسی کی ہے، نعمت اسی کی ہے، امر اسی کا ہے، قوت اور زور بالکل اسکے ہاتھ میں ہے، ہر چیز چار و ناچار اسی کی اطاعت کر رہی ہے، اسکے سوا نہ کسی کے پاس کوئی اقتدار ہے، نہ کسی کا حکم چلتا ہے، نہ کوئی خلق اور تدبیر اور انتظام کے رازوں سے واقف ہے، اور نہ کوئی اختیارات حکومت میں ذرہ برابر شریک و حصہ دار ہے، لہٰذا اسکے سوا حقیقت میں کوئی الٰہ نہیں ہے۔ اور جب حقیقت میں کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے تو تمہارا ہر وہ فعل جو تم دوسروں کو الٰہ سمجھتے ہوئے کرتے ہو اصلاً غلط ہے خواہ وہ دعا مانگنے یا پناہ ڈھونڈنے کا فعل ہو، یا خوف و رجا کا فعل ہو، یا سفارشی بنانے کا فعل ہو، یا حکم ماننے اور اطاعت کرنے کا فعل ہو۔ یہ تمام تعلقات جو تم نے دوسروں سے قائم کر رکھے ہیں صرف اللہ کے لیے مخصوص ہونے چاہئیں کیونکہ وہی اکیلا صاحب اقتدار ہے۔

اس باب میں قرآن جس طریقہ سے استدلال کرتا ہے وہ اسی کی زبان سے سنیئے:

وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَّ
فِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْعَلِيمُ (الزخرف ۷)

وہی ہے جو آسمان میں بھی اکیلا الٰہ ہے اور زمین
میں بھی وہی الٰہ ہے، اور وہی حکیم اور علیم ہے
(یعنی آسمان و زمین میں حکومت کرنے کے لیے جس علم اور حکمت کی ضرورت ہے وہ اسی کے پاس ہے)

أَفَمَن يَخْلُقُ كَمَن لَّا يَخْلُقُ
أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ... وَالَّذِينَ يَدْعُونَ
مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ
يُخْلَقُونَ ... إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (النحل ۲-۳)

تو کیا وہ جو پیدا کرتا ہے اور وہ جو پیدا نہیں کرتا
دونوں یکساں ہو سکتے ہیں؟ کیا تمہاری سمجھ میں اتنی بات
نہیں آتی؟ ..... خدا کو چھوڑ کر یہ جن دوسروں کو
پکارتے ہیں وہ تو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود
پیدا کیے جاتے ہیں ..... تمہارا الٰہ تو ایک ہی الٰہ ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ
عَلَيْكُمْ هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُم
مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ
فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ (فاطر-۱)

لوگو! تم پر اللہ کا جو احسان ہے اس کا دھیان کرو،
کیا اللہ کے سوا کوئی دوسرا خالق ہے جو تم کو آسمان اور
زمین سے رزق دیتا ہو؟ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے،
پھر تم کدھر بھٹکائے جا رہے ہو؟

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ أَخَذَ اللَّهُ
سَمْعَكُمْ وَأَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلَىٰ
قُلُوبِكُم مَّنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللَّهِ يَأْتِيكُم
بِهِ (انعام-۵)

کہو تم نے کبھی سوچا کہ اگر اللہ تمہاری سننے اور
دیکھنے کی قوتیں سلب کرلے اور تمہارے دلوں پر
مہر کر دے (یعنی عقل چھین لے) تو اللہ کے سوا اور
کونسا الٰہ ہے جو یہ چیزیں تمہیں لا دیگا؟

وَهُوَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ لَهُ
الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ وَلَهُ

وہی اللہ ہے کہ اس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ اسی
کے لیے تعریف ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۔ قُلْ أَرَأَيْتُمْ
إِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ اللَّيْلَ سَرْمَدًا
إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَأْتِيكُمْ
بِضِيَاءٍ أَفَلَا تَسْمَعُونَ ۔ قُلْ أَرَأَيْتُمْ
إِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا
إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَنْ إِلَٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَأْتِيكُمْ
بِلَيْلٍ تَسْكُنُونَ فِيهِ أَفَلَا تُبْصِرُونَ (قصص - ۷)

وہی اکیلا صاحبِ حکم و اقتدار ہے - اور اسی کی
طرف تم پلٹائے جانے والے ہو۔ کہو تم نے کبھی غور کیا
کہ اگر اللہ تم پر ہمیشہ کے لیے رات طاری کر دے تو
اسکے سوا کونسا دوسرا الٰہ ہے جو تمہیں روشنی لا دیگا؟
کیا تم سنتے نہیں ہو؟ کہو تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا
کہ اگر اللہ تمہارے اوپر ہمیشہ کے لیے دن طاری کر دے
تو اس کے سوا اور کونسا الٰہ ہے جو تمہیں رات لا دیگا
کہ اس میں تم سکون حاصل کرو؟ کیا تمہیں نظر نہیں آتا؟

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ
مِنْ دُونِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ
ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ
وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَمَا لَهُ
مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ ۔ وَلَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ
عِنْدَهُ إِلَّا لِمَنْ أَذِنَ لَهُ (السبا - ۳)

کہو کہ اللہ کے سوا جن کو تم نے الٰہ سمجھ رکھا ہے انہیں
پکار دیکھو، وہ نہ آسمانوں میں ذرہ برابر کسی چیز کے
مالک ہیں اور نہ زمین میں، نہ آسمان و زمین کے
انتظام میں ان کی کوئی شرکت ہے، نہ ان میں سے
کوئی اللہ کا مددگار ہے، اور نہ اللہ کے ہاں کوئی
سفارش کام آتی ہے بجز اُس کے جس کے حق
میں اللہ خود ہی سفارش کی اجازت دے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ
بِالْحَقِّ يُكَوِّرُ اللَّيْلَ عَلَى النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ
النَّهَارَ عَلَى اللَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ
وَالْقَمَرَ كُلٌّ يَجْرِي لِأَجَلٍ مُسَمًّى .....

اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے
وہ رات کو دن پر اور دن کو رات پر چڑھا کر لاتا ہے
اس نے سورج اور چاند کو تابع کر رکھا ہے اور ہر ایک
اپنی مدت مقررہ تک چل رہا ہے ......

...خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ، يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ، ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ (الزمر-۱)

... اس نے ایک نفس سے تمہاری پیدائش کی ابتدا کی (یعنی نسل انسانی کا آغاز کیا) پھر اسی نفس سے اس کا جوڑا بنایا اور تمہارے لیے مویشیوں کے آٹھ جوڑے اتارے۔ وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ میں اس طرح پیدا کرتا ہے کہ تین پردوں[1] کے اندر تمہاری تخلیق کے یکے بعد دیگرے کئی مدارج طے ہوتے ہیں۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے، اقتدار حکومت اسی کا ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، پھر تم کدھر پھیرے جا رہے ہو؟

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ حَدَآئِقَ ذَاتَ بَهْجَةٍ مَا كَانَ لَكُمْ اَنْ تُنْۢبِتُوْا شَجَرَهَا، ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ، بَلْ هُمْ قَوْمٌ يَّعْدِلُوْنَ - اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّجَعَلَ خِلٰلَهَآ اَنْهٰرًا وَّجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا، ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ، بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ - اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ، ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ، قَلِيْلًا

کون ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تمہارے لیے آسمان سے پانی برسایا پھر وہ خوش منظر باغ اگائے جنکے درخت اگانا تمہارے بس میں نہ تھا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں شریک ہے؟ مگر یہ لوگ حقیقت سے منہ موڑتے ہیں۔ پھر وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور اس میں دریا جاری کیے اور اس کے لیے پہاڑوں کو لنگر بنایا اور دو سمندروں کے درمیان پردہ حائل کیا؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں بھی شریک ہے؟ مگر اکثر مشرکین بے علم ہیں۔ پھر وہ کون ہے جو اضطرار کی حالت میں آدمی کی دعا

[1] تین پردوں سے مراد پیٹ، رحم اور مشیمہ ہے

مَّا تَذَكَّرُونَ - اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَنْ يُّرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ تَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ - اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَمَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (النمل - ۵)

سنتا ہے اور تکلیف دور کرتا ہے؟ اور وہ کون ہے جو تم کو زمین میں خلیفہ بناتا ہے (یعنی تصرف کے اختیارات دیتا ہے)؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں بھی شریک ہے؟ مگر تم کم ہی دھیان کرتے ہو۔ پھر وہ کون ہے جو تم کو خشکی اور تری کے اندھیاروں میں راستہ دکھاتا ہے اور کون اپنی رحمت (یعنی بارش) سے پہلے خوشخبری لانے والی ہوائیں بھیجتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں بھی شریک ہے؟ اللہ بالاتر ہے ان کے اس شرک سے جو یہ کرتے ہیں۔ پھر وہ کون ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا اور اس کا اعادہ کرتا ہے، اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور الٰہ ان کاموں میں بھی شریک ہے؟ کہو اگر تم اپنے شرک میں سچے ہو تو اس پر دلیل[1] لاؤ۔

اَلَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً لَّا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ

وہ جو آسمانوں اور زمین کی حکومت کا مالک ہے اور جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے اور اقتدار حکومت میں جس کا کوئی شریک نہیں ہے اور جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور ہر چیز کے لیے پورا پورا اندازہ مقرر کیا ہے، لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے الٰہ بنا لیے ہیں جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں، جو خود اپنے

[1] یعنی اگر تم مانتے ہو کہ یہ سب کام اللہ ہی کے ہیں اور ان کاموں میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے تو آخر کس دلیل سے تم الٰہیت میں اس کے ساتھ دوسروں کو شریک بناتے ہو؟ جن کے پاس اقتدار نہیں اور زمین و آسمان میں جن کا کوئی خود مختارانہ کام نہیں وہ الٰہ کیسے ہو گئے؟

لِاَنْفُسِهِمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا وَّلَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا (الفرقان-۱)

ذات کے لیے بھی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے اور جنکو موت اور زندگی اور دوبارہ پیدائش پر کسی قسم کا اقتدار حاصل نہیں ہے۔

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ وَّخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ وَّهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (انعام-۱۳)

آسمان و زمین کو عدم سے وجود میں لانے والا اسکا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اسکی کوئی بیوی نہیں ہے، اس نے تو ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا رب، کوئی اسکے سوا الٰہ نہیں ہے، ہر چیز کا خالق ہے، لہٰذا تم اسی کی عبادت کرو اور وہی ہر چیز کی حفاظت و خبرگیری کا کفیل ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (بقرہ-۲۰)

بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو خدائی میں اسکا شریک و مماثل قرار دیتے ہیں اور اللہ کی طرح اُنکو بھی محبوب رکھتے ہیں، حالانکہ جو ایمان لانے والے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ کاش یہ ظالم اُس حقیقت کو جسے نزولِ عذاب کے وقت محسوس کرینگے آج ہی محسوس کر لیتے کہ قوت ساری کی ساری اللہ ہی کے پاس ہے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗٓ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ (احقاف-۱)

کہو تم نے اپنے ان معبودوں کی حالت پر کبھی غور بھی کیا جنہیں تم خدا کے بجائے حاجت روائی کے لیے پکارتے ہو؟ مجھے دکھاؤ تو سہی کہ زمین کا کتنا حصہ ان کا بنایا ہوا ہے اور آسمانوں کی پیدائش میں انکی کس قدر شرکت ہے؟ ..... اس سے بڑھ کر اور کون گمراہ ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر

کسی ایسے کو پکارے جو قیامت تک اسے جواب نہیں دے سکتا۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ (انبیاء - ۲)

اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا اور بھی الٰہ ہوتے تو نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔ پس اللہ جو عرش (یعنی کائنات کے تخت سلطنت) کا مالک ہے اُن تمام باتوں سے پاک ہے جو یہ اسکی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وہ اپنے کسی فعل کے لیے جواب دہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں۔

مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِن وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ (المومنون - ۵)

اللہ نے نہ کوئی بیٹا بنایا اور نہ اسکے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر الٰہ اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کو لے کر اُٹھتا اور ہر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتا۔

قُل لَّوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَّابْتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا سُبْحَانَهُ وَتَعَالَىٰ عَمَّا يَقُولُونَ عُلُوًّا كَبِيرًا (بنی اسرائیل - ۵)

اے نبی کہو کہ اگر اللہ کے ساتھ دوسرے الٰہ ہوتے جیسا کہ لوگوں کا بیان ہے، تو وہ مالک عرش کی حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے ضرور تدبیریں تلاش کرتے۔ پاک ہے وہ اور بہت بالاتر ہے ان باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

ان تمام آیات میں اول سے آخر تک ایک ہی مرکزی خیال پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ الٰہیت اور اقتدار لازم و ملزوم ہیں، اور اپنی روح و معنی کے اعتبار سے دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ جو اقتدار نہیں رکھتا وہ الٰہ نہیں ہو سکتا اور اسے الٰہ نہ ہونا چاہیے، اور جو اقتدار رکھتا ہے وہی الٰہ ہو سکتا ہے اور اسی کو الٰہ ہونا چاہیے، کیونکہ الٰہ سے تمہاری جس قدر ضروریات متعلق ہیں، یا جن ضروریات کی خاطر تمہیں کسی کو الٰہ ماننے کی حاجت پیش آتی ہے، ان میں سے کوئی ضرورت بھی اقتدار کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی، لہٰذا غیر مقتدر کا الٰہ ہونا بے معنی ہے،

حقیقت کے خلاف ہے، اور اسکی طرف رجوع کرنا لاحاصل ہے۔

اس مرکزی خیال کو لے کر قرآن جس طریقہ سے استدلال کرتا ہے اسکے مقدمات اور نتائج حسب ذیل ترتیب کے ساتھ اچھی طرح سمجھ میں آسکتے ہیں:

(۱) حاجت روائی، مشکل کشائی، پناہ دہندگی، امداد و اعانت، خبرگیری و حفاظت، اور استجابت دعوات جنکو تم نے معمولی کام سمجھ رکھا ہے، دراصل یہ معمولی کام نہیں ہیں بلکہ انکا سر رشتہ پورے نظام کائنات کی تخلیقی اور انتظامی قوتوں سے جا ملتا ہے۔ تمہاری ذرا ذرا سی ضرورتیں جس طرح پوری ہوتی ہیں اس پر غور کرو تو تم کو معلوم ہو کہ زمین و آسمان کے عظیم الشان کارخانہ میں بیشمار اسباب کی مجموعی حرکت کے بغیر ان کا پورا ہونا محال ہے۔ پانی کا ایک گلاس جو تم پیتے ہو، اور گیہوں کا ایک دانہ جو تم کھاتے ہو، اسکو مہیا کرنے کے لیے سورج اور زمین اور ہواؤں اور سمندروں کو خدا جانے کتنا کام کرنا پڑتا ہے تب کہیں یہ چیزیں تم کو بہم پہنچتی ہیں۔ پس تمہاری دعائیں سننے اور تمہاری حاجتیں رفع کرنے کے لیے کوئی معمولی اقتدار نہیں بلکہ وہ اقتدار درکار ہے جو زمین و آسمان کو پیدا کرنے کے لیے، سیاروں کو حرکت دینے کے لیے، ہواؤں کو گردش دینے اور بارش برسانے کے لیے، غرض پوری کائنات کا انتظام کرنے کے لیے درکار ہے۔

(۲) یہ اقتدار ناقابل تقسیم ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خلق کا اقتدار کسی کے پاس ہو، اور رزق کا کسی اور کے پاس، سورج کسی کے قبضہ میں ہو اور زمین کسی اور کے قبضہ میں، پیدا کرنا کسی کے اختیار میں ہو، بیماری و صحت کسی اور کے اختیار میں، اور موت اور زندگی کسی تیسرے کے اختیار میں۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ نظام کائنات کبھی چل ہی نہ سکتا۔ لہٰذا تمام اقتدارات و اختیارات کا ایک ہی مرکزی فرمانروا کے قبضہ میں ہونا ضروری ہے، کائنات کا انتظام چاہتا ہے کہ ایسا ہو، اور فی الواقع ایسا ہی ہے۔

(۳) جب تمام اقتدار ایک ہی فرمانروا کے ہاتھ میں ہے اور اقتدار میں کسی کا ذرہ برابر کوئی حصہ نہیں ہے تو لا محالہ الوہیت بھی بالکلیہ اُسی فرمانروا کے لیے خاص ہے اور اس میں بھی کوئی حصہ دار نہیں ہے۔ کسی میں یہ طاقت نہیں کہ تمہاری فریاد رسی کر سکے، دعائیں قبول کر سکے، پناہ دے سکے، حامی و ناصر اور ولی و کارساز بن سکے، نفع یا نقصان پہنچا سکے۔ لہذا الٰہ کا جو مفہوم بھی تمہارے ذہن میں ہے اسکے لحاظ سے کوئی دوسرا الٰہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ کوئی اس معنی میں بھی الٰہ نہیں کہ فرمانروائے کائنات کے ہاں مقرب بارگاہ ہونے کی حیثیت ہی سے اس کا کچھ زور چلتا ہو اور اسکی سفارش مانی جاتی ہو۔ اُسکے انتظام سلطنت میں کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں، کوئی اسکے معاملات میں دخل نہیں دے سکتا، اور سفارش قبول کرنا یا نہ کرنا بالکل اسی کے اختیار میں ہے، کوئی زور کسی کے پاس نہیں ہے کہ اُسکے بل پر وہ اپنی سفارش قبول کرا سکے۔

(۴) اقتدار اعلیٰ کی واحدانیت کا اقتضاء یہ ہے کہ حاکمیت و فرمانروائی کی جتنی قسمیں ہیں سب ایک ہی مقتدرِ اعلیٰ کی ذات میں مرکوز ہوں اور حاکمیت کا کوئی جزو بھی کسی دوسرے کی طرف منتقل نہ ہو۔ جب خالق وہ ہے اور خلق میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، جب رازق وہ ہے اور رزق رسانی میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، جب پورے نظام کائنات کا مدبر و منتظم وہ ہے اور تدبیر و انتظام میں کوئی اس کے ساتھ شریک نہیں، تو یقیناً حاکم اور آمر اور شارع بھی اسی کو ہونا چاہیے اور اقتدار کی اس شق میں بھی کسی کے شریک ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جس طرح اسکی سلطنت کے دائرے میں اُسکے سوا کسی دوسرے کا فریاد رس اور حاجت روا اور پناہ دہندہ ہونا غلط ہے اُسی طرح کسی دوسرے کا مستقل بالذات حاکم اور خود مختار فرمانروا اور آزاد قانون ساز ہونا بھی غلط ہے۔ تخلیق اور رزق رسانی، احیاء اور اماتت، تسخیر شمس و قمر اور تکویر لیل و نہار، قضاء اور قدر، حکم اور بادشاہی، امر اور تشریع سب ایک ہی کلی اقتدار و حاکمیت کے مختلف پہلو

ہیں اور یہ اقتدار و حاکمیت ناقابلِ تقسیم ہے ۔ اگر کوئی شخص اللہ کے حکم کی سند کے بغیر کسی کے حکم کو واجب الاطاعت سمجھتا ہے تو وہ ویسا ہی شرک کرتا ہے جیسا ایک غیر اللہ سے دعا مانگنے والا شرک کرتا ہے ۔ اور اگر کوئی شخص سیاسی معنی میں مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ اور حاکمِ علی الاطلاق ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ، تو اسکا یہ دعویٰ بالکل اسی طرح خدائی کا دعویٰ ہے جس طرح فوق الطبیعی معنی میں کسی کا یہ کہنا کہ میں تمہارا ولی و کارساز اور مددگار و محافظ ہوں ۔ اسی لیے جہاں خلق اور تقدیرِ اشیاء اور تدبیرِ کائنات میں اللہ کے لاشریک ہونے کا ذکر کیا گیا ہے وہیں لہُ الحکم اور لہُ الملک اور لم یکن لہ شریکٌ فی الملک بھی کہا گیا ہے جو اس بات پر صاف دلالت کرتا ہے کہ الوہیت کے مفہوم میں پادشاہی و حکمرانی کا مفہوم بھی شامل ہے اور توحید الٰہ کے لیے لازم ہے کہ اس مفہوم کے اعتبار سے بھی اللہ کے ساتھ کسی کی شرکت نہ تسلیم کی جائے ۔ اس کو اور زیادہ کھول کر حسبِ ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے :

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ	کہو یا اللہ تو جو ملک کا مالک ہے ، تجھے اختیار ہے
تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ	جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے
مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ	چھین لے اور جسے چاہے عزت دے اور جس کو چاہے
مَنْ تَشَآءُ (آل عمران ۔ ۳)	ذلیل کر دے ۔
فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ، لَآ اِلٰهَ	پس بالا و برتر ہے اللہ جو حقیقی پادشاہ ہے ، اسکے
اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ (المؤمنون ۔ ۶)	سوا کوئی الٰہ نہیں وہ عرشِ بزرگ کا مالک ہے ۔
قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ مَلِكِ	کہو میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب سے ،
النَّاسِ اِلٰهِ النَّاسِ (الناس)	انسانوں کے پادشاہ سے ، انسانوں کے الٰہ سے ۔

اور اس سے زیادہ تصریح سورۂ مومن میں ہے جہاں فرمایا :

يَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۭ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۭ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (رکوع-۲)

یعنی جس روز سب لوگ بے نقاب ہونگے، کسی کا کوئی راز اللہ سے چھپا نہ ہوگا، اس وقت پکارا جائیگا کہ آج بادشاہی کس کی ہے؟ اور جواب اسکے سوا کچھ نہ ہوگا کہ اس اکیلے اللہ کی جس کا اقتدار سب پر غالب ہے۔ اس آیت کی بہترین تفسیر وہ حدیث ہے جو امام احمد نے حضرت عبداللہ ابن عمر سے روایت کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا انه تعالیٰ یطوی السمٰوات والارض بیدہ ثم یقول انا الملک انا الجبار انا المتکبر، این ملوک الارض؟ این الجبارون؟ این المتکبرون؟ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو اپنی مٹھی میں لیکر پکاریگا میں ہوں بادشاہ، میں ہوں جبار، میں ہوں متکبر، کہاں ہیں وہ جو زمین میں بادشاہ بنتے تھے؟ کہاں ہیں جبار؟ کہاں ہیں متکبر؟۔ عبداللہ ابن عمر فرماتے ہیں کہ جس وقت حضور خطبہ میں یہ الفاظ فرما رہے تھے اس وقت آپ پر ایسا لرزہ طاری تھا کہ ہم ڈر رہے تھے کہ کہیں آپ منبر سے گر نہ پڑیں۔

(باقی)

معراج کی رات

[یہ وہ تقریر ہے جو ۲۰؍ اگست کو نشرگاہ لاہور سے نشر کی گئی تھی اور آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے یہاں نقل کی جاتی ہے]

عام روایت کے مطابق آج کی رات معراج کی رات ہے۔ یہ معراج کا واقعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے سب سے زیادہ مشہور واقعات میں سے ہے۔ لیکن یہ جس قدر مشہور ہے اسی قدر افسانوں کی تہیں اس پر چڑھ گئی ہیں۔ عام لوگ عجوبہ پسند ہوتے ہیں۔ انکی عجائب پسندی کے جذبہ کو بس اپنی تسکین کا سامان چاہیے۔ اسلیے معراج کی اصل روح اور اسکی غرض اور اسکے فائدوں اور نتیجوں کو تو انہوں نے نظرانداز کر دیا اور ساری گفتگو اس پر ہونے لگی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جسم کے ساتھ آسمان پر گئے تھے یا صرف روح گئی تھی، براق کیا تھا، جنت اور دوزخ کا حال آپ نے کیا دیکھا اور فرشتے کس شکل کے تھے۔ حالانکہ دراصل یہ واقعہ تاریخ انسانی کے ان بڑے واقعات میں سے ہے جنہوں نے زمانہ کی رفتار کو بدلا اور تاریخ پر اپنا مستقل اثر چھوڑا ہے۔ اور اسکی حقیقی اہمیت کیفیت معراج میں نہیں بلکہ مقصد اور نتیجۂ معراج میں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ کرۂ زمین جس پر ہم آپ رہتے ہیں خدا کی عظیم الشان سلطنت کا ایک چھوٹا سا صوبہ ہے۔ اس صوبہ میں خدا کی طرف سے جو پیغمبر بھیجے گئے ہیں انکی حیثیت کچھ اس طرح کی سمجھ لیجیے جیسے دنیا کی حکومتیں اپنے ماتحت ملکوں میں گورنر یا وائسرائے بھیجا کرتی

ہیں۔ ایک لحاظ سے دونوں میں بڑا بھاری فرق ہے۔ دنیوی حکومتوں کے گورنر اور وائسرائے محض انتظام ملکی کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں۔ اور سلطان کائنات کے گورنر اور وائسرائے اس لیے مقرر ہوتے ہیں کہ انسان کو صحیح تہذیب، پاکیزہ اخلاق، اور سچے علم و عمل کے وہ اصول بتائیں جو روشنی کے مینارے کی طرح انسانی زندگی کی شاہراہ پر کھڑے ہوئے صدیوں تک سیدھا راستہ دکھاتے رہیں۔ مگر اس فرق کے باوجود دونوں میں ایک طرح کی مشابہت بھی ہے۔ دنیا کی حکومتیں گورنری جیسے ذمہ داری کے منصب انہی لوگوں کو دیتی ہیں جو انکے سب سے زیادہ قابل اعتماد آدمی ہوتے ہیں، اور جب وہ انہیں اس عہدے پر مقرر کر دیتی ہیں تو پھر انہیں یہ دیکھنے اور سمجھنے کا پورا موقع دیتی ہیں کہ حکومت کا اندرونی نظام کس طرح کس پالیسی پر چل رہا ہے، اور ان کے سامنے اپنے وہ راز بے نقاب کر دیتی ہیں جو عام رعایا پر ظاہر نہیں کیے جاتے۔ ایسا ہی حال خدا کی سلطنت کا بھی ہے۔ وہاں بھی پیغمبری جیسے ذمہ داری کے منصب پر وہی لوگ مقرر ہوتے ہیں جو سب سے زیادہ قابل اعتماد تھے، اور جب انہیں اس منصب پر مقرر کر دیا گیا تو اللہ تعالیٰ نے خود انکو اپنی سلطنت کے اندرونی نظام کا مشاہدہ کرایا اور ان پر کائنات کے وہ اسرار ظاہر کیے جو عام انسانوں پر ظاہر نہیں کیے جاتے۔

مثال کے طور پر حضرت ابراہیم کو آسمان اور زمین کے ملکوت، یعنی اندرونی انتظام کا مشاہدہ کرایا گیا[1] اور یہ بھی آنکھوں سے دکھا دیا گیا کہ خدا کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے[2]۔ حضرت موسیٰ کو طور پر جلوۂ ربانی دکھایا گیا اور ایک خاص بندے کے ساتھ کچھ مدت تک پھرایا گیا تاکہ اللہ کی مشیت کے تحت دنیا کا انتظام جس طرح ہوتا ہے اسکو دیکھیں اور سمجھیں[3]۔ ایسے ہی کچھ تجربات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] وکذالک نری ابراھیم ملکوت السمٰوات والارض (انعام - ۸)

[2] واذ قال ابراھیم رب ارنی کیف تحی الموتیٰ (بقرہ - ۳۵)

[3] فوجدا عبدا من عبادنا اٰتینٰہ رحمۃ من عندنا وعلمنٰہ من لدنا علما (کہف ۹ - ۱۰)

کے بھی تھے۔ کبھی آپ خدا کے مقرب فرشتے کو افق پر علانیہ دیکھتے ہیں[1]، کبھی وہ فرشتہ آپ سے قریب ہوتے ہوتے اس قدر قریب آجاتا ہے کہ آپ کے اور اسکے درمیان دو کمانوں کے بقدر بلکہ اس سے بھی کچھ کم فاصلہ رہ جاتا ہے۔ کبھی وہی فرشتہ آپکو سدرۃ المنتہیٰ، یعنی عالم مادی کی آخری سرحد پر ملتا ہے اور وہاں آپ خدا کی عظیم الشان نشانیاں دیکھتے ہیں[2]۔

اسی نوعیت کے تجربات میں سے ایک وہ چیز ہے جس کو معراج کہتے ہیں۔ معراج صرف سیر اور مشاہدہ ہی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایسے موقع پر ہوتی ہے جبکہ پیغمبر کو کسی کار خاص پر مقرر کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے اور اہم ہدایات دی جاتی ہیں۔ وہ حضرت موسیٰ کی معراج ہی تھی جبکہ انکو وادی سینا میں بلا کر احکام عشرہ (Ten Commandments) دیے گئے اور انکو حکم دیا گیا کہ مصر جا کر فرعون کو منشاء خداوندی کے مطابق نظام حکومت میں اصلاح کرنے کی دعوت دو۔ اسی طرح وہ حضرت عیسیٰ کی معراج تھی جب انہوں نے ساری رات پہاڑ پر گذاری اور پھر اٹھ کر بارہ رسول مقرر کیے اور وہ وعظ کہا جو پہاڑی کے وعظ کے نام سے مشہور ہے۔ ایسا ہی ایک اہم موقع وہ تھا جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو طلب کیا گیا۔

یہ وہ وقت تھا جب آپ کو اپنے مشن کی تبلیغ کرتے ہوئے تقریباً بارہ سال گذر چکے تھے، حجاز کے اکثر قبائل میں، اور قریب کے ملک حبش میں آپ کی آواز پہنچ چکی تھی، اور آپکی تحریک ایک مرحلہ سے گذر کر دوسرے مرحلہ میں قدم رکھنے کو تھی۔ دوسرے مرحلہ سے میری مراد یہ ہے کہ اب وقت آگیا تھا کہ آپ مکہ کی ناموافق سرزمین کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف منتقل ہو جائیں جہاں آپ کی کامیابی کے لیے زمین تیار تھی۔ اس دوسرے مرحلہ میں آپ کا مشن بہت پھیلنے والا تھا۔ صرف حجاز اور صرف عرب ہی

---

[1] ولقد رآہ بالافق المبین (التکویر)

[2] وھو بالافق الاعلیٰ .... الی قولہ لقد رأی من آیت ربہ الکبریٰ (النجم - ۱)

نہیں بلکہ گردو پیش کی دوسری قوموں سے بھی سابقہ پیش آنا تھا، اور اسلام کی تحریک ایک اسٹیٹ میں تبدیل ہونے کو تھی، اسلیے اس اہم موقع پر آپ کو ایک نیا پروانۂ تقرر اور نئی ہدایات دینے کے لیے پادشاہ کائنات نے اپنے حضور میں طلب فرمایا۔

اسی پیشی و حضوری کا نام معراج ہے۔ عالم بالا کا یہ حیرت انگیز سفر ہجرت سے تقریباً ایک سال پہلے پیش آیا تھا۔ اس سفر کے ضمنی واقعات احادیث میں آئے ہیں، مثلاً بیت المقدس پہنچ کر نماز ادا کرنا، آسمان کے مختلف طبقات سے گذرنا، پچھلے زمانہ کے پیغمبروں سے ملنا اور پھر آخری منزل پر پہنچنا۔ لیکن قرآن ضمنی چیزوں کو چھوڑ کر ہمیشہ اصل مقصد تک اپنے بیان کو محدود رکھتا ہے اس لیے اس نے کیفیت معراج کا کچھ ذکر نہیں کیا بلکہ وہ چیز تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے جس کے لیے آنحضرت کو بلایا گیا تھا۔ قرآن کی سترھویں سورت میں آپکو یہ تفصیل ملسکتی ہے۔ اسکے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ میں مکہ کے لوگوں کو آخری نوٹس دیا گیا کہ اگر تمہاری سختیوں کی وجہ سے خدا کا پیغمبر جلاوطنی پر مجبور ہوا تو مکہ میں تم کو چند سال سے زیادہ رہنے کا موقع نہ مل سکے گا[1]۔ اور بنی اسرائیل کو، جن سے عنقریب مدینہ میں پیغمبر سے براہ راست سابقہ پیش آنا تھا، خبردار کیا گیا کہ تم اپنی تاریخ میں دو زبردست ٹھوکریں کھا چکے ہو اور دو قیمتی موقعے کھو چکے ہو، اب تم کو تیسرا موقع ملنے والا ہے اور یہ آخری موقع ہے[2]۔

دوسرے حصہ میں وہ بنیادی اصول بتائے گئے جن پر انسانی تمدن و اخلاق کی تعمیر ہونی چاہیے۔ یہ ۱۴ اصول ہیں[3]:

[1] وان کادوا لیستفزونک من الارض لیخرجوک منہا واذاً لا یلبثون خلفک الا قلیلا (بنی اسرائیل ۸)

[2] وقضینا الی بنی اسرائیل ۔۔۔۔ الی قولہ عسیٰ ربکم ان یرحمکم (بنی اسرائیل ۱)

[3] سورۂ بنی اسرائیل رکوع ۳-۴

(۱) صرف اللہ کی بندگی کی جائے اور اقتدار اعلیٰ میں اسکے ساتھ کسی کی شرکت نہ تسلیم کیجائے۔

(۲) تمدن میں خاندان کی اہمیت ملحوظ رکھی جائے، اولاد والدین کی فرمانبردار و خدمت گذار ہو اور رشتہ دار ایک دوسرے کے ہمدرد و مددگار ہوں۔

(۳) سوسائیٹی میں جو لوگ غریب یا معذور رہوں یا اپنے وطن سے باہر مدد کے محتاج ہوں وہ بے وسیلہ نہ چھوڑ دیئے جائیں۔

(۴) دولت کو فضول ضائع نہ کیا جائے جو مالدار اپنے روپے کو برے طریقہ سے خرچ کرتے ہیں وہ شیطان کے بھائی ہیں۔

(۵) لوگ اپنے خرچ کو اعتدال پر رکھیں، نہ بخل کرکے دولت کو روکیں اور نہ فضول خرچی کرکے اپنے لیے اور دوسرے کے لیے مشکلات پیدا کریں۔

(۶) رزق کی تقسیم کا قدرتی انتظام جو خدا نے کیا ہے انسان اس میں اپنے مصنوعی طریقوں سے خلل نہ ڈالے، خدا اپنے انتظام کی مصلحتوں کو زیادہ بہتر جانتا ہے۔

(۷) معاشی مشکلات کے خوف سے لوگ اپنی نسل کی افزائش نہ روکیں۔ جس طرح موجودہ نسلوں کے رزق کا انتظام خدا نے کیا ہے آنے والی نسلوں کے لیے بھی وہی انتظام کریگا۔

(۸) خواہشِ نفس کو پورا کرنے کے لیے زنا کا راستہ برا راستہ ہے لہذا نہ صرف زنا سے پرہیز کیا جائے بلکہ اسکے قریب جانے والے اسباب کا دروازہ بھی بند ہونا چاہیے۔

(۹) انسانی جان کی حرمت خدا نے قائم کی ہے لہذا خدا کے مقرر کردہ قانون کے سوا کسی دوسری بنیاد پر آدمی کا خون نہ بہایا جائے، نہ کوئی اپنی جان دے، نہ دوسرے کی جان لے۔

(۱۰) یتیموں کے مال کی حفاظت کی جائے، جب تک وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ ہوں ان کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

(۱۱) عہد و پیمان کو پورا کیا جائے، انسان اپنے معاہدات کے لیے خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔

(۱۲) تجارتی معاملات میں ناپ تول ٹھیک ٹھیک راستی پر ہونی چاہیے، اوزان اور پیمانے صحیح رکھے جائیں۔

(۱۳) جس چیز کا تمہیں علم نہ ہو اس کی پیروی نہ کرو، وہم اور گمان پر نہ چلو، کیونکہ آدمی کو اپنی تمام قوتوں کے متعلق خدا کے سامنے جواب دہی کرنی ہے کہ اس نے انہیں کس طرح استعمال کیا۔

(۱۴) نخوت اور تکبر کے ساتھ نہ چلو، غرور کی چال سے نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ پہاڑوں سے اونچے ہو سکتے ہو۔

یہ ۱۴ اصول جو معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیئے گئے تھے، انکی حیثیت صرف اخلاقی تعلیمات ہی کی نہ تھی، بلکہ یہ وہ پروگرام تھا جس پر آپ کو آئندہ سوسائیٹی کی تعمیر کرنی تھی۔ یہ ہدایات اُس وقت دی گئی تھیں جب آپکی تحریک عنقریب تبلیغ کے مرحلہ سے گذر کر حکومت اور سیاسی اقتدار کے مرحلے میں قدم رکھنے والی تھی، لہذا یہ گویا ایک مینی فسٹو تھا جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ خدا کا پیغمبر ان اصولوں پر تمدن کا نظام قائم کریگا۔ اسی لیے معراج میں یہ ۱۴ نکات مقرر کرنے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے تمام پیروانِ اسلام کے لیے پانچ وقت کی نماز فرض کی[۱] تاکہ جو لوگ اس پروگرام کو عمل کا جامہ پہنانے کے لیے اٹھیں ان میں اخلاقی انضباط پیدا ہو اور وہ خدا سے غافل نہ ہونے پائیں، ہر روز پانچ مرتبہ انکے ذہن میں یہ بات تازہ ہوتی رہے کہ وہ خود مختار نہیں ہیں بلکہ ان کا حاکمِ اعلیٰ خدا ہے جسکو انہیں اپنے کام کا حساب دینا ہے۔

---

[۱] اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الیٰ غسق اللیل وقرآن الفجر ان قرآن الفجر کان مشہودا (بنی اسرائیل۔ ۹)

بقیہ مضمون صفحہ ۱۴۱

تو دراصل وہ خدا کے مقابلہ میں بغاوت کرتا ہے اور علیٰ ہٰذا القیاس جو شخص اس شعبۂ زندگی میں کسی دوسرے کی حاکمیت و آمریت تسلیم کرتا ہے وہ بھی بغاوت ہی کا ارتکاب کرتا ہے۔ مومن کا کام اس بغاوت کو دنیا سے مٹانا اور خدا کی زمین پر خدا کے سوا ہر ایک کی خداوندی ختم کر دینا ہے۔ مومن کی زندگی کا مشن یہ ہے کہ جس طرح خدا کا قانونِ تکوینی تمام کائنات میں نافذ ہے اسی طرح خدا کا قانون شرعی بھی عالم انسانی میں نافذ ہو۔ مومن کی تمام مساعی کا ہدف مقصود یہ ہے کہ وہ خدا کے بندوں کو خدا کے سوا ہر ایک کی بندگی سے نکالے اور صرف خدا کا بندہ بنائے یہ کام فی الاصل تو نصیحت، فہمائش، ترغیب اور تبلیغ ہی سے کرنے کا ہے۔ لیکن جو لوگ ملک خدا کے ناجائز مالک بن بیٹھے ہیں اور خدا کے بندوں کو اپنا بندہ بنا لیتے ہیں وہ عموماً اپنی خداوندی سے محض نصیحتوں کی بنا پر دست بردار نہیں ہو جایا کرتے، اور نہ وہ اس کو گوارا کرتے ہیں کہ عامۃ الناس میں حقیقت کا علم پھیلے، کیونکہ اس سے ان کو خطرہ ہوتا ہے کہ اُن کی خداوندی خود بخود ختم ہو جائے گی، اس لئے مومن کو مجبوراً جنگ کرنی پڑتی ہے تاکہ حکومت الٰہیہ کے قیام میں جو چیز سدِ راہ ہو اسے راستہ سے ہٹا دے۔

نظام جماعت

۴۔ ہر وہ شخص (خواہ وہ عورت ہو یا مرد اور خواہ وہ کسی قوم یا نسل سے تعلق رکھتا ہو، اور خواہ وہ دنیا کے کسی حصہ کا باشندہ ہو) جو عقیدۂ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کو اس کے پورے مفہوم کے ساتھ سمجھ کر شہادت دے کہ یہی اس کا عقیدہ ہے، وہ جماعت اسلامی کا رکن ہو سکتا ہے۔ اس شہادت کے سوا اس جماعت میں داخل ہونے کے لئے کوئی شرط نہیں ہے

تشریح:۔ اس جماعت میں کوئی شخص محض اس مفروضہ پر شامل نہیں ہو سکتا کہ جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہوگا۔ اسی طرح کوئی شخص کلمۂ طیبہ کے الفاظ کو بے سمجھے بوجھے محض زبان سے ادا کر کے بھی اس جماعت میں نہیں آ سکتا۔ اس دائرے

میں آنے کے لئے شرط لازم یہ ہے کہ آدمی کو کلمۂ طیّبہ کے معنی و مفہوم کا علم ہو وہ جانتا ہو کہ اس کلمہ میں نفی کس چیز کی ہے اور اثبات کس چیز کا، اور اس نفی و اثبات کی شہادت دینے سے اس پر کیا ذمہ داریاں عاید ہوتی ہیں، اور یہ شہادت اس کے طرزِ خیال و طرزِ زندگی میں کس قسم کے تغیّر کا تقاضا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد جو شخص اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہنے کی جرأت کرے صرف وہی جماعت اسلامی میں داخل ہو سکتا ہے خواہ وہ پیدائشی غیر مسلم ہو اور ابتداءً یہ شہادت ادا کرے، یا پیدائشی مسلمان ہو اور از سرِ نو ایمان لائے۔

۴۔ ادائے شہادت کے بعد جو تغیّرات لازماً ایک شخص کو اپنی زندگی میں کرنے ہوں گے وہ یہ ہیں:۔

(الف) فرائض کو ان کی شرعی پابندیوں کے ساتھ ادا کرے،

(ب) کبائر سے اجتناب کرے اور اگر نادانستہ کسی کبیرہ کا مرتکب ہو جائے تو اس سے توبہ کرے،

(ج) اگر وہ کوئی ایسا ذریعہ معاش رکھتا ہو جو معصیت فاحشہ کی تعریف میں آتا ہے مثلاً سود، شراب، زنا، رقص و سرود، شہادت زور، رشوت، خیانت، قمار، قتال فی غیر سبیل اللہ وغیرہ، تو اس کو ترک کر دے بلا اس لحاظ کے کہ اس کے ترک کرنے میں کتنا ہی نقصان ہو، اور اگر اس کی معاش میں ان وسائل کا کوئی حصہ ہو تو وہ اس حصہ سے اپنی معیشت کو پاک کرے،

(د) اگر اس کے قبضہ میں ایسا مال (یا جائداد) ہو جو حرام طریقہ سے آیا ہو، یا جس میں حقدار رعل کے تلف کردہ حقوق شامل ہوں تو اس سے دست بردار ہو جائے اور اہل حقوق کو ان کے حق پہنچا دے،

(ہ) اگر وہ کسی ایسی حکومت کا صدر، یا رئیس، یا گورنر، یا وزیر یا جج ہے جو زمین کے کسی حصہ پر حاکمیت (Sovereignty) کی مدعی ہو تو اپنے اس منصب سے دست بردار ہو جائے،

(و) اگر وہ کسی مجلس قانون ساز کا رکن ہو تو اس سے مستعفی ہو جائے کیونکہ قانون سازی صرف خدا کا منصب ہے اور انسان کا قانون ساز بننا خدائی کے دعوے کو متضمن ہے،

(س) اگر وہ کسی غیر الٰہی نظام کی طرف سے خطاب رکھتا ہو تو اس کو واپس کرے اور اُن وفاداریوں اور نیاز مندیوں سے باز آئے جن کی بدولت اس نے خطاب پایا تھا یا جن کو اب خطاب یافتہ ہونے کی وجہ سے نباہنا پڑتا ہے۔

یہ تغیرات جس شخص کی زندگی میں فوراً رونما نہ ہوں اس کے متعلق یہ سمجھا جائے گا کہ وہ کلمۂ شہادت ادا کرنے میں صادق نہ تھا اور اس بنا پر وہ جماعت میں نہ لیا جائے گا۔ یا لیا جا چکا ہو تو خارج کیا جائے گا۔

۵۔ ادائے شہادت کے بعد بتدریج جو تغیرات ہر شخص کو اپنی زندگی میں کرنے ہوں گے وُہ یہ ہیں:۔

(الف) دین کا کم از کم اتنا علم حاصل کر لینا کہ اسلام اور جاہلیت (غیر اسلام) کا فرق معلوم ہو اور حدود اللہ سے واقفیت حاصل ہو جائے،

(ب)، تمام معاملات میں اپنے نقطۂ نظر، طرز خیال اور عمل کو ہدایت الٰہی کے مطابق ڈھالنا اپنی زندگی کے مقصد، اپنی پسند اور قدر کے معیار، اور اپنی وفاداریوں کے محور کو تبدیل کر کے رضائے الٰہی کے موافق بنانا، اور اپنی خودسری و نفس پرستی کے بت کو توڑ کر تابع امر رب بن جانا،

(ج) اُن تمام رسوم جاہلیت سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے خلاف ہوں، اور اپنے ظاہر و باطن کو احکام شریعت کے مطابق بنانے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرنا،

(د)، تمام اُن تعصبات اور دلچسپیوں سے اپنے قلب کو، اور ان مشاغل اور جھگڑوں اور بحثوں سے اپنی زندگی کو پاک کرنا جن کی بنا نفسانیت یا دنیا پرستی پر ہو اور جن کی کوئی اہمیت دین میں نہ ہو،

(ہ) فاسقین و فجار اور خدا سے غافل لوگوں سے ربط و تعلق توڑنا اور صالحین سے ربط قائم کرنا،

(و) ان تمام اداروں سے تعلق منقطع کرنا جو جاہلیت کی خدمت کرتے ہوں اور جن کا مقصد حاکمیت رب العالمین کے قیام و اثبات کے سوا کچھ اور ہو (ایسے اداروں کے ساتھ وقتی ضروریات کے لحاظ سے تعاون یا صلح و موادعت کے معاملات کیے جا سکتے ہیں، مگر یہ افراد کا کام نہیں بلکہ جماعت کا کام ہے کوئی مسلمان انفرادی طور پر ایسے کسی ادارے کا جزء نہیں بن سکتا)،

(ز) اپنے معاملات کو راستی، عدل، خدا ترسی، اور بے لاگ حق پرستی پر قائم کرنا،

(ح) اپنی دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کو قیام حکومت الٰہیہ کے نصب العین پر مرتکز کر دینا اور اپنی ضروریات زندگی کے سوا اُن تمام مصروفیتوں سے دست کش ہو جانا جو اس نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں،

ضروری نہیں کہ یہ تغیرات تمام اشخاص میں کمال درجہ پر ہوں، مگر ہر شخص کو اس باب میں اپنی تکمیل کی کوشش کرنی ہوگی کیونکہ انہی تغیرات کے اعتبار سے ناقص یا کامل ہونے پر جماعت اسلامی میں آدمی کے مرتبے کا تعین ہوگا۔

۶۔ جو لوگ غیر الٰہی نظام حکومت کو چلانے میں آلہ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں یا غیر الٰہی قانون کے اجرا میں مددگار بنتے ہیں اُن کی تین حیثیتیں ہیں:۔

اگر وہ اپنے اس کام پر خوش اور مطمئن ہیں اور اپنے اس کسب کو حلال و طیب سمجھتے ہیں اور اسی راہ میں ترقی درجات کے متمنی ہیں تو ان کے لئے اس دائرے میں کوئی جگہ نہیں۔

اگر وہ اس نظام کو غلط اور اپنے کسب کو حرام سمجھتے ہیں، مگر اعتراف گناہ کے باوجود اس کو محض ضعف ایمان کی وجہ سے ترک نہیں کر سکتے، تو وہ جماعت اسلامی کے طبقہ سوم میں (جس کی تشریح آگے آتی ہے) داخل ہو سکتے ہیں۔

اگر وہ محض اس مجبوری سے اس نظام میں منسلک ہیں کہ دوسرا ذریعہ زندگی نہیں پاتے، اور نیک نیتی کے ساتھ اس بات کے لئے تیار ہوں کہ دوسرا ذریعہ پاتے ہی اسے ترک کر دیں گے، تو وہ جماعت اسلامی کے درجہ دوم میں (جس کی تشریح آگے آتی ہے) داخل ہو سکتے ہیں۔

تشریح:۔ یہ واضح ہے کہ غیر الٰہی نظام اطاعت کے ایک جز اور دوسرے جز میں کوئی فرق نہیں اس کے جو اجزا بظاہر بالکل معصوم نظر آتے ہیں وہ بھی اسی قدر ناپاک ہیں جس قدر دوسرے غیر معصوم اجزاء

نیز جو غیر الٰہی نظام اطاعت مسلمانوں کی غداوندی میں چل رہا ہے وہ بھی اپنے تمام اجزاء سمیت اسی حکم میں ہے۔ مسلمانوں کی خداوندی اس کو ہرگز کوئی سند طہارت عطا نہیں کرتی۔

۷۔ جہاں ایک شخص متذکرۂ صدر طریقہ پر ایمان لائے یا رکھتا ہو، اس کے لئے لازم ہے کہ ایک طرف اپنے حلقہ تعارف میں دوسرے مردوں اور عورتوں کو دعوت ایمان دے، اور دوسری طرف اپنی بستی میں ان لوگوں کو تلاش کرے جو اس کی طرح ایمان لائے ہوں۔ پھر جہاں ایسے دو آدمی بھی مل جائیں وہاں وہ عارضی طور پر جماعتی ہیئت بنالیں اور مرکز کو اطلاع دے کر اس سے ہدایت حاصل کریں۔

۸۔ جو لوگ نظام جماعت میں شامل ہوں ان کو ان کے حالات کے لحاظ سے ابتداءً تین طبقوں میں تقسیم کیا جائے گا:۔

ایسے اشخاص جو تن من دھن سے جماعت میں شریک ہوں، جو اسلامی نصب العین کے حصول کی جدوجہد میں ہر قربانی کے لئے تیار ہوں، جو اپنے آپ کو بلا کسی استحفاظ و استثناء کے اس طرح جماعت کے حوالہ کریں کہ جب ان کو پکارا جائے، لبیک کہیں، جو خدمت ان کے سپرد کی جائے انجام دیں، اور جان، مال، اولاد، عزیز، اقارب، دوست غرض کسی چیز کو بھی مقصد اسلامی سے زیادہ عزیز نہ رکھیں، وہ صفِ اوّل کے لوگ ہوں گے، جماعت کا اصل کارکن و کار فرما عنصر یہی ہوں گے، اور رہنمائی و سربراہ کاری انہی کے ہاتھ میں ہوگی۔ ان لوگوں کے لئے احکام شرعیہ کی پابندی کے معاملہ میں کوئی رعایت نہ ہوگی۔ ان کو مسلمان کی زندگی کا پورا نمونہ پیش کرنا ہوگا اور ان کے لئے رخصت کے بجائے عزیمت کا طریقہ ہی قانون ہوگا۔ نیز ان کے لئے لازم ہوگا کہ کسی غیر الٰہی عدالت میں مستغیث یا مدعی کی حیثیت سے نہ جائیں، مدعیٰ علیہ یا مستغاث علیہ کی حیثیت سے خاص حالات میں جا سکتے ہیں جبکہ غیر معمولی نقصان کا خطرہ ہو، البتہ سردست گواہ کی حیثیت سے اگر ان کو طلب کیا جائے تو وہ جائیں۔

وہ لوگ جو اپنے آپ کو بالکلیہ وقف کرنے کی طاقت نہ رکھتے ہوں اور نہ خطرات اور قربانیوں کا پورا

پورا بار اٹھا سکتے ہوں، مگر اپنے وقت، اپنے مال اور اپنی قوتوں کا ایک حصہ اپنی ذات کی خدمت سے بچا کر راہ خدا میں دینے کے لئے تیار ہوں وہ طبقہ دوم میں شمار ہوں گے بشرطیکہ اپنی شخصی زندگی کی حد تک احکام دین کی پوری اطاعت کریں، ان وسائل کسب رزق اور مشاغل سے مجتنب ہیں جو براہ راست دین حق کے خلاف ہیں، اور صدق دل سے جماعت اسلامی کے خیر خواہ و وفادار ہوں۔ جماعت کی طرف سے ان کے سپرد وہی خدمات کی جائیں گی جن کو وہ خود بخوشی قبول کریں۔ ذمہ داری کا کوئی منصب ان کے سپرد نہ کیا جائے گا۔ اور جماعتی مشورں میں وہ شریک ہو سکیں گے۔

جو لوگ کلمۂ اسلام پر اصولی حیثیت سے ایمان لائیں اور شخصی زندگی کی حد تک احکام شرعی کی پابندی بھی قبول کریں، مگر غیر الٰہی نظام سے ان کے جو مفاد وابستہ ہیں ان کا نقصان گوارا نہ کر سکیں وہ طبقۂ سوم میں داخل ہوں گے اور ان کا شمار ہمدردوں میں ہو گا۔ بشرطیکہ وہ دوسری وفاداریوں پر خدا کی وفاداری کو مقدم رکھیں، غیر الٰہی نظام میں ترقی درجات کیلئے کوشاں نہ ہوں، اور جماعت اسلامی کو ہر جائز امکانی طریقے سے مدد دیں۔ جماعتی مشورہ میں وہ صرف اس حد تک شریک ہو سکتے ہیں جس حد تک جماعت کو ان کے خلوص پر اعتماد ہو۔

تشریح: طبقات کی یہ تقسیم تمام اشخاص کے حق میں دائمی و ابدی نہ ہو گی بلکہ شخصی حالات کے تغیر و تبدل کے ساتھ بدلتی رہے گی۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی طبقہ سوم کے ایک شخص کی حالت بدل جائے اور وہ طبقۂ اول میں آ جائے اور علیٰ ہذا القیاس اس کے برعکس۔

عورتوں کی حیثیت

۹۔ جو عورتیں جماعت اسلامی میں داخل ہوں ان پر دفعہ چہارم اور دفعہ پنجم کے تمام ان اجزاء کا اطلاق ہو گا جو مخصوص طور پر مردوں سے متعلق نہیں ہیں یعنی جو تمام اہل ایمان کے لئے عمومی نوعیت رکھتے ہیں۔

۱۰۔ رکن جماعت ہونے کی حیثیت سے عورتوں کے فرائض حسب ذیل ہوں گے:۔

(الف) اپنے خاندان اور اپنے حلقۂ تعارف میں دوسری عورتوں کو تجدید ایمان یا قبول ایمان کی دعوت دیں

(ب) اپنے شوہروں، بھائیوں اور خاندان کے دوسرے مردوں پر دین کی تبلیغ کریں۔

(ج) اپنے بچوں کے دلوں میں نور ایمان اور اخلاق اسلامی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔

(د) اگر ان کے شوہر یا بیٹے یا باپ اور بھائی جماعت اسلامی میں داخل ہوں تو اپنی صابرانہ رفاقت سے اُن کی ہمت افزائی کریں اور جماعت کے نصب العین کی خدمت میں حتی الامکان ان کا ہاتھ بٹائیں اور نزول مصائب کی صورت میں صبر و ثبات سے کام لیں۔

(ہ) اگر ان کے شوہر یا اولیاء جاہلیت میں مبتلا ہوں، حرام کماتے ہوں یا معاصی کا ارتکاب کرتے ہوں تو صبر کے ساتھ ان کی اصلاح کے لئے ساعی رہیں، اُن کی حرام کمائی سے اور ان کی ضلالتوں سے محفوظ رہنے کی انتہائی کوشش کریں، اور ان کے ایسے احکام کو ماننے سے انکار کردیں جو معصیت خدا اور رسول کے مترادف ہوں بلا اس لحاظ کے کہ اُن کی حکم عدولی کے نتائج کتنے ہی بُرے ہوں۔

امارت

۱۰۔ اس جماعت کا ایک امیر ہوگا جس کی حیثیت "امیر المومنین" (باصطلاح معروف) کی نہ ہوگی بلکہ صرف اس جماعت کے رہنما کی ہوگی۔ اس کی اطاعت فی المعروف جماعت کے کل افراد اپنے امیر (باصطلاح شرعی) کی حیثیت سے کریں گے۔ امیر کے انتخاب میں تقویٰ، علم دین میں بصیرت، اصابت رائے، اور عزم و حزم کو ملحوظ رکھا جائے گا۔ جماعت کی دعوت اپنے عقیدہ اور نصب العین کی طرف ہوگی نہ کہ اپنے امیر کی شخصیت اور اس کی امارت کی طرف۔ جماعت کی نظر میں انتخاب کے وقت جو شخص بھی مذکورۂ بالا اوصاف کے لحاظ سے اہل تر ہوگا اس کو وہ اس منصب کے لئے منتخب کرے گی۔

امیر کی خدا ترسی و احساس ذمہ داری سے یہ توقع کی جائے گی کہ اپنے سے زیادہ اہل آدمی کے آجانے پر وہ خود اس کے لئے جگہ خالی کردے گا۔ نیز ایسی صورت میں جبکہ جماعت اپنے نصب العین کے مفاد کے لئے ضرورت محسوس کرے، وہ امیر کو معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی۔

ابتدائی لائحہ عمل

(۱) جماعت کا ابتدائی پروگرام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک طرف اس میں شامل ہونے والے افراد اپنے نفس اور اپنی زندگی کا تزکیہ کریں، اور دوسری طرف جماعت سے باہر جو لوگ ہوں (خواہ وہ قومی مسلمان ہوں یا غیر مسلم) ان کو بالعموم حاکمیت غیر اللہ کا انکار کرنے اور حاکمیت رب العالمین کو تسلیم کرنے کی دعوت دیں۔ اس دعوت کی راہ میں جب تک کسی کی قوت حائل نہ ہو، ان کو بھی چھیڑ چھاڑ کی ضرورت نہیں۔ اور جب کوئی قوت حائل ہو، خواہ وہ کوئی قوت ہو، تو ان کو اس کے علی الرغم اپنے عقیدہ کی تبلیغ کرنی ہوگی اور اس تبلیغ میں جو مصائب بھی پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنا ہوگا۔

بعد کے مراحل کے متعلق اس وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جیسے حالات پیش آئیں گے انہی کے لحاظ سے قدم اٹھایا جائے گا۔ البتہ لوگوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ ایک مضبوط جمے ہوئے اور زمین پر چھائے ہوئے دین (نظام اطاعت غیر اللہ) کو اکھاڑ کر دوسرے دین (نظام اطاعت الٰہی) کو قائم کرنا بہرحال آسان کام نہیں ہے۔ اس میں جان، مال اور ہر چیز کا زیاں ہے، لہٰذا وہی لوگ آگے بڑھیں جو تمام فائدوں اور آسائشوں کی قربانی اور تمام نقصانات کی برداشت کے لئے تیار ہوں۔

[illegible] پریس [illegible] لاہور میں طبع ہوا

الجہاد فی الاسلام

تالیف ابو الاعلیٰ مودودی

دور جدید میں یورپ نے اپنی سیاسی اغراض کیلئے اسلام پر جو بہتان تراشے ہیں ان میں سے سب سے بڑا بہتان یہ ہے کہ اسلام ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیرووں کو خونریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اس بہتان کی اگر کچھہ حقیقت ہوتی تو قدرتی طور پر اسے اسوقت پیش ہونا چاہئے تھا جبکہ پیروان اسلام کی شمشیر خاراشگاف نے کرۂ زمین میں ایک تہلکہ مچا رکھا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس بہتان کی پیدائشی آفتاب عروج اسلام کے غروب ہونے کے بہت عرصہ بعد عمل میں آئی اور اسکے خیالی پتلے میں اسوقت روح پھونکی گئی جبکہ اسلام کی تلوار تو زنگ کھا چکی تھی۔ مگر خود اس کے موجد یورپ کی تلوار بےگناہوں کے خون سے سرخ ہو رہی تھی اور اس نے دنیا کی کمزور قوموں کو اسطرح نگلنا شروع کر دیا تھا جیسے کوئی اژدھا چھوٹے چھوٹے جانوروں کو ڈستا اور نگلتا ہو۔ اگر دنیا میں عقل ہوتی تو وہ سوال کرتی کہ جو لوگ خود امن و امان کے سب سے بڑے دشمن ہوں جنھوں نے خود خون بہا بہا کر زمین کے چہرہ کو رنگین کردیا ہو اور جو خود قوموں کے چین اور آرام پر ڈاکے ڈال رہے ہوں انہیں کیا حق ہے کہ وہ اسلام پر وہ الزام عائد کریں جسکی فرد جرم خود ان پر لگنی چاہئے؟

لیکن انسان کی کچھہ فطری کمزوری ہے کہ وہ جب میدان میں مغلوب ہوتا ہے تو مدرسہ میں بھی مغلوب ہو جاتا ہے۔ جسکی تلوار سے شکست کھاتا ہے اس کے قلم کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا اور اسلئے ہر عہد میں دنیا پر انہی افکار و آراء کا غلبہ رہتا ہے جو تلواربند ہاتھوں کے قلم سے پیش کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ اس مسئلہ میں بھی دنیا کی آنکھوں پر پردہ ڈالنے میں یورپ کو پوری کامیابی ہوئی اور غلامانہ ذہنیت رکھنےوالی قوموں نے اسلامی جہاد کے متعلق اسکے پیش کردہ نظریہ کو بلا ادنیٰ تحقیق و تفحّص اور بلا ادنیٰ غور و خوض اسطرح قبول کرلیا کہ آسمانی وحی کو بھی اسطرح قبول نہ کیا گیا ہوگا۔

پس اگر آپ اسلامی جہاد کی حقیقت اور اسکے متعلقہ مسائل سے کما حقہ واقف ہونا چاہتے ہیں تو "الجہاد فی الاسلام" کا مطالعہ فرمائیے۔ اسلامی لٹریچر میں اس موضوع پر شروع اسلام سے اب تک اس پایہ کی کوئی کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔

ضخامت ۵۰۰ صفحات قیمت بیجلد چار روپے مجلد پانچ روپے علاوہ محصولڈاک

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن" - لاہور